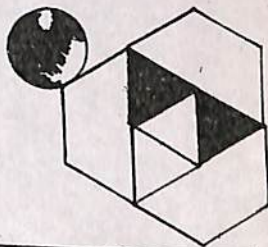
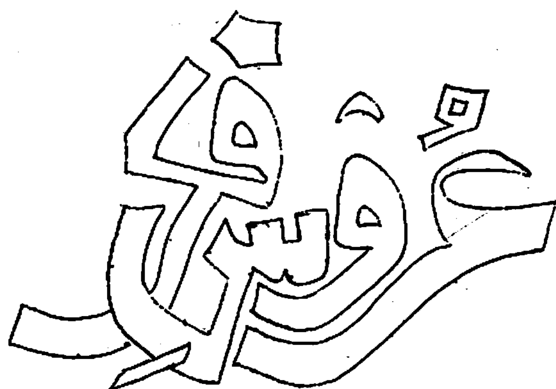
عروسِ فن

پرچھوسے طوفان



UROOS-E-FIKR [THE BRIDE OF THOUGHT — URDU POEMS]

BY BRIJ MOHAN TOOFAN PRICE 50/=



برج موہن طوفان

نازش بک سینٹر

• دہلی-۱۱۰۰۰۶ • ٹونک-۳۰۴۰۰۱

اشاعت : ۱۱ جولائی ۱۹۹۰ء

طباعت : نرمان پریس - دہلی

خوشنویس : راحت علی خاں رامپوری

قیمت : پچاس روپے 50/=

زیرِ اہتمام
ارشد علی خاں

ملنے کے پتے :
۱- مصنف
۲- نازش بک سینٹر - ۳۲۰ - پھاٹک تیلیان - ترکمان گیٹ - دہلی - ۱۱۰۰۰۶
۳- نازش بک سینٹر - گھیر میر عالم خاں - اندرون نائب صاحب کی نال - ٹونک ۳۰۴۰۰۱

انتساب

دریائے صداقت کے نام

جس کا کہیں نام و نشان نہیں

عروسِ فکر

۱۔ فنا وبقا ــــــ جسم وجاں ــــــ ۱۱

۲۔ چراغ ولحد ــــــ خاک وخون ــــــ ۳۵

۳۔ فراق ووصال ــــــ آہ وبکا ــــــ ۵۳

۴۔ کفر وایمان ــــــ دار ورسن ــــــ ۹۳

۵۔ دشت ودمن ــــــ خس وخار ــــــ ۱۰۵

۶۔ دیر وحرم ــــــ عذاب وثواب ــــــ ۱۲۱

۷۔ گیر ودار ــــــ جوش وغضب ــــــ ۱۳۵

۸۔ مجازی وحقیقی ــــــ طبل ودف ــــــ ۱۴۷

۹۔ خورشید وقمر ــــــ شیشہ وجام ــــــ ۱۵۵

پیش لفظ و حرفِ آخر

ہر سفر اکیلا ہی ہوتا ہے اور طویل بھی۔ کیوں کہ ہر سفر کئی بدلے ہوئے ارادوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مَیں نے کوئی سفر طے نہیں کیا اِس لیے میرے لیے کہنا مشکل ہے کہ زندگی اچھی ہے یا موت۔ ہاں مجھے کئی بار کسی نے موت کی زَد سے بچا لیا اور ہر نئی زندگی سِسکیاں بھرتی نظر آئی۔ اس دَوران مَیں نے قہقہے بھی لگائے اور کئی ناہموار راستوں کو ہموار کرنے کی بھی کوشش کی۔ یہ کوشش اُس دن بے سُود نظر آئی جب میں زندگی اور مَوت دونوں سے محروم ہوتا دکھائی دیا۔

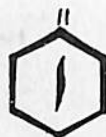
زندانِ زندگی میں اِتنے رِند ملے اور اتنے خم لُنڈھے کہ میکدے خالی ہو گئے اور ساقی اس انداز سے پیش آئے کہ جان پر کھیلتے ہی بنی۔ ہر حُسن نے اپنی بااختیاری جتلائی تو ضرور لیکن ان کا اعجاز بھی چند روز بعد بے اثر ہو گیا۔ مَیں نے صلیب بھی اُٹھائی اور کانٹوں کا تاج بھی پہنا — دریائے صداقت میں غوطہ لگانے کی ٹھانی تو پاؤں میں کثافت کے پتھر باندھ کر میرے ڈوب جانے پر کوئی فکر مند نہ ہوا۔ صرف خورشید و قمر نے ہمدردی جتانے کی کوشش کی۔ کثافت کے پتھر آپس میں ٹکرا ٹکرا کر ٹوٹ گئے اور مَیں پانی کی سطح کا مُنہ چومنے کے لیے پھر اُبھر آیا۔ کہیں سے ایک صبح کی خوشبو نے مجھے اپنی طرف راغب کر لیا۔ بس پھر کیا تھا موجوں نے مجھے خواہشات کے ایک جزیرے کی طرف دھکیل دیا، جہاں عالمِ حقائق نے دونوں بازو کھول کر مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ جنسی خواہشات نے مجھے رَوند دیا، اور میں دیر تک کسی سُنہری زلفوں سے کھیلتا رہا۔ مَیں جانتا تھا کہ مَیں راستہ بھول چکا ہوں اور مجھے کسی راہبر کا انتظار ہے۔ گُل اندام مجھے راہِ راست پر نہ لا سکے اور نہ ہی پتھر و فولاد جیسے ارادے۔ جام و سُبو بیکا ثابت

ہوئے۔ دار و رسن کی دھمکیاں دھمکیاں ہی رہ گئیں۔ ساری زمین کو مَیں نے اپنا گھر سمجھنا چاہا لیکن ہر راستے میں دَیر و حَرم مخل ہوئے۔ کفر و ایمان سرِ بازار بِکتے نظر آئے اور میرا جوش و غضب آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ کر بھی کسی کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

کِسی نے طعنہ دیا کہ میرا عشق مجازی ہے۔ حقیقی عشق اسی مجازی عشق کا ہی بگڑا ہوا نام نظر آیا۔ فرق اتنا ہی تھا کہ حقیقی لگاؤ میں پسپائی و فرار کے کئی سوراخ تھے اور یہ جبر کے ماحول سے آزاد تھا۔ کئی بار نڈھال ہو کر گلستانوں میں پناہ چاہی لیکن صیادوں کے سایوں نے یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔ آہ و بکا کے علاوہ کیا چارہ تھا۔ تسلیم و رضا۔ سو اس کی رضائی لیے بھی برسوں سویا رہا لیکن گیر و دار کے زمانے میں اس سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ وفا کے سب معیار اپنی سطح سے گر گئے اور فراق و وصال ایک افسانہ ہو کر رہ گئے۔ راہ کے ہم سفر بچھڑنے تھے سو بچھڑے لیکن وائے مقصدِ حیات' میری خواہشِ منزل ہی ایک لمبی نیند سو گئی۔ اب کس دشت و دمن کی راہ لوں۔ کس کس خس و خار کو سر پہ سجاؤں۔ اُمیدوں کی تربت پر ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی مانند جلتا رہا۔ جسم و جاں پر قاتلوں نے بے شمار حملے کیے۔ زخم پہ زخم لگے اور جب دوست کے گلے لگنے کی تمنّا اُبھری، اُس نے بہ صورتِ شمشیر لبیک کہا۔ معاملہ فنا و بقا کے درمیان اٹک کر رہ گیا۔ میری تمام تر کارکردگیوں کا نہ ثواب ملا اور نہ ہی عذاب۔ البتّہ اشکوں کے سمندر سے اُبھرا تو عقل و فہم کی ریڑھ کی ہڈّی شکستہ ہو چکی تھی۔

یہ کتاب، یہ خیالات میرے خوابوں کی تعبیر ہیں۔ مَیں شاعر نہیں کیوں کہ ہنگاموں کی ہر زد میں مجھے عطا کی گئی شانِ خدائی دوشیزہ کی عصمت کی طرح لُٹ کر رہ جاتی ہے۔ میں فکر سے نبرد آزما رہا لیکن اس سے بھی مات کھائی، ہاں جب عروسِ فکر ایک سُہاگن کی شکل میں سامنے آئی تو مجھے نہ تو شہید ہونے میں دیر لگی اور نہ اس سے خاصی چھیڑ خانی کرنے میں۔

برج موہن طوفانؔ





فنا و بقا

جسم و جان



دعا مانگنے سے کیا مرنے والے کو کوئی راحت ملتی ہے یا نہیں ؟ اگر اُس کا یقین خدا
میں نہ بھی ہو تو بھی ممکن ہے کہ ایسا کرنے سے اُسے کچھ راحت ملے۔ دعا مانگتے وقت لب
کپکپاتے ہیں، کیوں کہ دعا مانگنے کی عادت نہیں اور اس کے ساتھ ہی دعا میں بھی ایک لرزہ
پیدا ہو جاتا ہے۔ ان دونوں حالتوں کے بعد فنا ہونے کا ہی امر باقی رہ جاتا ہے۔



میرا دعویٰ عشق تو اپنی جگہ برقرار رہا لیکن میری دعوتِ عشق کبھی قبول نہ ہوئی۔ لہٰذا
زندگی سے عاجز آنا لازمی ہو گیا ہے۔ یہ زندگی ایک طویل عذاب میں ڈھل گئی تھی اس عذاب
کا خاتمہ دعوتِ عشق قبول ہوئے بنا ہو ہی نہیں سکتا۔



تقدیر ٹلتی نہیں، لیکن تدبیر کے مسلسل ہوتے رہنے سے ہی کسی کارگر نتیجے کے
اخذ ہونے کی امید کی جا سکتی ہے۔ میری قسمت میں ان کا بوسہ نہیں لکھا تھا، لیکن میں نے
دلیری کی۔ ایک تدبیر کے تحت آگے بڑھ کر اپنے محبوب کا بوسہ لے لیا اور یہ بوسہ میری

تقدیر ہوگیا۔



چاہنے والے کی کیا درخواست ہے ؟ محبوب سے گڑگڑا کر کہتا ہے کہ دو گھڑی ساتھ بیٹھ کر عشق کرو، کیوں کہ اس کی جان پر بنی ہوتی ہے اور اذیت کا یہ راستہ سیدھا فنا کی طرف لے جاتا ہے۔ اگر محبوب یہ درخواست مان لے تو کیا اذیت مسرّت میں تبدیل ہوجائے گی، لیکن فنا کی آخری منزل کیسے ٹلے گی ؟



دریا کا ہر ایک قطرہ اس کا ایک جز ہوتا ہے، اس لیے کسی دریا کو دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ضرورت ایک قطرے کو بھی سامنے رکھ کر پوری کی جاسکتی ہے لیکن قطرے میں دریا کو دیکھنے کے لیے کیا اُس قطرے کو دریا سے الگ ہونا ضروری ہے ؟



یہ زمانہ مسیحاؤں کا ہے۔ ہر مسیحا کا دعویٰ ہے کہ شفا اس کے ہاتھ میں ہے۔ مسیحا رُوحانی ہو یا سیاسی بشر یا قوم کو بسترِ مرگ سے اُٹھانے کا دَم بھرتا جاتا ہے۔ لہٰذا ایسے حالات میں کسی بسترِ مرگ پر دَم توڑتے ہوئے بیمار کو دیکھنا ان مسیحاؤں کا کام ہوتا

ہے لیکن وہ اپنا کام سرانجام نہیں دیتے، کیوں کہ وہ خود موت سے خائف ہیں۔



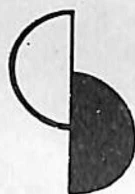
رُوح کی غارت گری عین اُس وقت طاری ہوتی ہے جب نشیلے بدن غیر نشیلے بدنوں سے ٹکراتے ہیں اور بیزاری رُوح کا باعث بنتے ہیں۔ میرا جسم بھی ایسے ہی جھلستے ہوئے بدن سے ٹکرایا، لیکن خدا کی قسم میری رُوح پاک باز رہی اور اجسام کی کثافت کا کوئی اثر اس پر نہیں ہوا۔



قدرت کا اپنا رسم و رواج ہے۔ انسان جب زندگی سے بیزاری دکھاتا ہے تو قدرت کی گود میں سَر چھپانے کی کوشش کرتا ہے جو کبھی تو فلک سے زمین تک کسی اسرار میں ڈھکی نظر آتی ہے اور کبھی دامن کی آلائشوں سے پاک برہنہ اور بے لباس۔



مُوت کا لطف ساقی کی آنکھوں کے اشاروں میں ہے۔ یہ عشق کا جہاد ہے، جو بہ یک وقت نیم خفتہ و نیم باز آنکھوں کے خلاف بے سُود اپنا اثر دکھانا چاہتا ہے۔



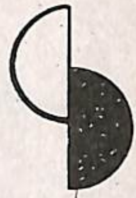
تیری لب کشائی تو اعجازِ مسیحا کہلاتی ہے لیکن اگر تو خاموشی اختیار کر لے تو اِسے غمِ جاناں کا ہی نام دیا جا سکے گا۔ کیا لب کشائی و خاموشی کے درمیان اور کوئی راستہ نہیں جو ہمارے کام آجائے۔



اگر زندگی کا نام حرکت ہے تو یہ خاک کے ذرّوں سے ہی شروع ہو سکتی ہے کیونکہ ستاروں کی دنیا تو منجمد ہے اور اس میں پرواز کا نام و نشان نہیں۔



موت اور زندگی کی ایک طویل داستان ہے جس کی ہزاروں تفسیریں لکھی جا چکی ہیں لیکن یہ کل حکایت ایک بے بنیاد سی ہے کیوں کہ تلوار کے میان سے باہر نکلتے ہی دم پہلے ہی نکل چکا ہوتا ہے۔ زندگی ہے کیا؟ صرف تلوار کا میان سے باہر آنا اور وہ بھی ایسے کے ہاتھوں میں جسے دیکھ کر پہلے ہی رُوح قبض ہو جاتی ہو۔



تہذیبِ حاضر کی دنیا ظلمت کدوں کا ایک انبار ہی نہیں بلکہ ایک کتاب ہے جس کا نہ تو کوئی ورق ہے اور نہ ہی اس کا کوئی اقتباس ہے۔ علم و عرفان اسی ظلمت کدے کا ایک حصّہ ہے جس کے اندر جھانکنے کی کوئی گنجائش نہیں۔



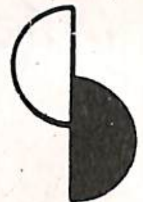
اِس دنیا کو ایک اُجڑی ہوئی خانقاہ سمجھ کر زندگی کو بے لطف نہ بناؤ۔ صرف لطف کے فلسفے کا انداز سمجھو۔ ساغر و سُبو سے دوستی رکھنا اور حسینوں سے ملاقاتوں کا تانتا لگائے رکھنا زندگی کی توقیر نہیں بلکہ کُشادگیِ قلندری ہے۔



حرص و ہَوَس کے دَور کی اتنی وسعتیں پھیلیں کہ انسان کے رگ و ریشے سے ذوقِ تجلّی نکل گیا۔ کسی نے کہا کہ یہ میری سمجھ کا قصور تھا جو زمانے کو تلقین کر رہا تھا کہ صاحبِ ادراک ہونا سیکھو۔ میری شکست لازمی تھی۔ میں زمانے کا بھٹکا ہوا راہی تھا اور خوابیدہ روحوں کو چنگاری دِکھانے کے ناقابل تھا۔



یہ جہاں کسی کو سازگار تو نہیں آتا لیکن ہمیں جتنا زندہ رہنا تھا وہ ہم بے تگ و دو رہ لیے۔ جب قضا آئی ہم خوش و خرّم اس کے ہمراہ ہو لیے۔ کیوں کہ ایسے رِندوں کے لیے قضا کے پاس کوئی معرکہ سَر کرنے کو باقی نہیں رہ جاتا اور کوئی مرحلہ طے کرنے کے لیے باقی نہیں رہتا۔



مَلکُ الموت کی نظر قہر آلود تھی جس کی زَد سے نہ کافر بچا نہ مومن۔ وہ خود وقت کا ملازم تھا اور حکم کا بندہ۔ اس کی قہر آلود نظر دراصل اس کی اپنی نظر بھی نہ تھی۔ وہ ایک ہلکا سا تبسّم تھا جو کافر و مومن کو ان کی بے جا سوچ و ریاضت سے نجات دلانے کے لیے حلیمی کا مجسّمہ بن کر آیا تھا۔



وقت سے کیا تنازعہ ہو سکتا ہے؟ اس کی مُہرِ فطرت کے ہر کھیل پر حاوی نظر آتی ہے۔ اسے نہ تدبیر سے تعلّق ہے اور نہ تقدیر سے، نہ احساس سے نہ مُروّت سے۔ لمحے پگھلے گئے تو صدیوں میں تبدیل ہو گئے اور صدیوں کی راکھ اُڑی تو چند سروں نے

اپنے کو سجا لیا۔ وقت نے راکھ کو پھر دھو دیا اور آنکھیں وقت کی بے نیازی پر آنسو بہانے لگیں۔



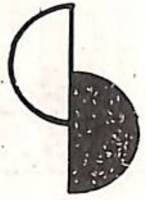
میری زندگی کا انحصار ان کی دید پر منحصر نہیں ہے۔ تسلیم کہ وہ ہماری طرف رجوع نہیں ہوتے لیکن زندہ رہنے کے کئی بہانے، کئی راہیں نکالی جا سکتی ہیں۔ تمنا صرف تمہیں دیکھ کر ہی زندہ رہنے کی نہیں بلکہ کئی نظاروں کو اپنے میں سمو کر زندہ رکھا جا سکتا ہے۔



کسی خوب رُو کو اگر للچائی نگاہوں سے نہ دیکھو تو وہ جل بھن اٹھتا ہے۔ زمانے کی رو کو پہچانتے ہوئے میں اسی لیے ہر خوب صورت چہرے کو اپنے دل و دماغ پر



چھانے کی دعوت دیتا ہوں۔ ہر رخسار کو چومنا تو ممکن نہیں، گو جی تو چاہتا ہے لیکن ان میں سے چند کو اپنے نزد بٹھایا تو جا سکتا ہے۔ درویشی سدا خوب صورتی کی تلاش میں ہی رہتی ہے۔



یہ خوشگوار چہرے ہیں اور یہ روندے ہوئے مضمحل چہرے، جن کا سُوکھے ہوئے پتّوں کی طرح رنگ اُڑ چکا ہے اور جن کی آنکھوں میں سیاہ غاروں کی تاریکی اُداس پیرہن اوڑھے بیٹھی ہے۔ دستِ نقاش برابر اپنے کام میں مصروف ہے۔ خوش گوار اور روندھے ہوئے چہرے تشکیل کرنے میں نقاش کی یہ نقاشی کسی ایسے عجائب گھر میں رکھی جانی چاہیے جہاں سے لوگ آنکھیں بند کرکے آگے کو نکل جاتے ہیں۔



زندگی چلتی ہوئی سڑک ہے۔ طلسمِ خوفِ روزگار نے ہر ایک کو زندگی کا شیدائی بنا رکھا ہے۔ نہ نظر اِدھر اُدھر جاتی ہے اور نہ ہی کسی محبوب کی نگاہوں سے نگاہ ملتی ہے۔ سڑک کا ہر کونہ گذرگاہ ہے لیکن یہ ایک کونے میں ایک سمٹی ہوئی لاش کیسے پڑی ہے؟ جسے دیکھ کر نہ ماتھے پر پسینہ آتا ہے اور نہ دل میں خوفِ خدا پیدا ہوتا ہے۔ دو چار ہلکے پھلکے اجسام بھی قریب سے نکل گئے جن کی تابشِ رُخ سے اس لاش میں کوئی بھی جنبش نہیں ہوئی۔



زندگی نے جو کچھ بھی مجھے سکھانا تھا بہ بانگِ دہل سکھا گئی ہے۔ دیکھو کیا اب میں وہی

ہوں جو کل تھا؛ میں بہروپیا بن گیا ہوں اس زندگی کے ہاتھوں۔ مجھے یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ زندگی مجھے دروغ گوئی بھی سکھا دے گی جس کا اپنا ہی ایک لطف ہے۔ گذری ہوئی شب کا خمار کب کا ختم ہو چکا ہے لیکن میں تو دروغ گوئی کا سہارا لیے عجیب وہم میں مبتلا ہوں کہ یہ خمار از سرِ نو چڑھے گا اور بھی شدت کے ساتھ۔



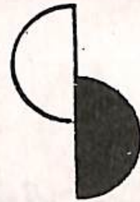
حاصلِ حیات ہے کیا؟ اِس سوال نے ایک لمبی اور جٹل سوچ میں ڈال دیا۔ قدرت اور کچھ ہو نہ ہو غم شناس تو ضرور ہے۔ اس نے اس سوچ کے مسئلے کا حل یہ نکالا کہ مجھے ایک لمبی نیند میں سُلا دیا۔ سیلِ موت اس چٹان سی سوچ پر حاوی آیا۔



زندگی کے کئی شعبوں میں کام کرتے ہوئے دیر ہو جاتی ہے لیکن جب محبوب کے آنے میں دیر ہوئی تو وہ تغیر رونما ہوا کہ ہمارے اپنے رونے کا انداز ہی بدل گیا جب روتے روتے جسم سے جان نکل گئی تو لاش پر جو کفن ڈالا گیا اس کا رنگ بھی بدل گیا۔



اے میرے دوست تم ہی تو کائنات کا کُل مفہوم نہیں ہو۔ اور نہ تم دنیا کی کُل اُمیدوں کا سہارا ہو۔ ہماری طرف دیکھو۔ بجلیوں کی زد میں ہم نے اپنا آشیانہ بنا رکھا ہے۔ بجلیاں گاہے گاہے اسے نذرِ آتش کرنے کے لیے بیقرار ہو اٹھتی ہیں تو یہ بیقراری بھی کائنات کا ایک اہم حصّہ ہوا۔ کائنات کا خونِ جگر تمھیں نہیں ہم بھی ہیں۔



روزِ محشر کے آنے میں کتنی صبحیں اور شامیں باقی ہیں کوئی نہیں جانتا۔ کتنی غم کی گھڑیاں اور سپنے باقی ہیں کہا نہیں جا سکتا۔ جب ماجرا یہ ہے تو دل کو اطمینان ہونا چاہیے تھا لیکن جو بھی دن طلوع ہوتا ہے وہ اپنے ساتھ کچھ ایسے نغمے لاتا ہے جو دن بھر کانوں میں گھُلتے رہتے ہیں۔ ہر آنے والا دن نہ جانے کیوں نیا بوجھ لے کر آتا ہے اور روزِ محشر کے آنے میں کتنی دیر ہے کوئی نہیں جانتا۔



کبھی کبھی انسان کا یہ گِلہ جائز نظر آتا ہے کہ موت اس سے خفا کیوں ہو گئی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مرگِ ناگہانی کے قصّے کیوں دہرائے جاتے۔ شاید انسان دنیا



کے مصائب سے خوف زدہ ہوکر موت کا متمنی ہو جاتا ہے لیکن چاہتا مرگِ ناگہانی ہی ہے۔ چاہتا تو نہیں صرف اس کو طویل تکلیف، وہ موت پر ترجیح دیتا ہے۔ شاید یہ بھی جھوٹ ہے۔



ہر شخص تو نہیں البتہ کچھ زندگی کے راز ڈھونڈنے میں مصروف ہیں۔ یہ لوگ ایسا کب تک کرتے رہیں گے۔ فکر کی یہ پرواز جس کا نتیجہ ایک فریبِ آرزو کے علاوہ کچھ نہیں کب تک بے سود رہے گی۔



لوگ محبت کو کئی مصیبتوں کا موردِ الزام ٹھہراتے ہیں لیکن اُن سے ذرا پوچھا جائے کہ محبت کی تاثیر سے پہلے اُن کی دُنیا میں تھا کیا۔

انسان تدبیر ڈھونڈنے کی سوچتا رہتا ہے لیکن چوں کہ ہر ہر تدبیر کا نتیجہ یکساں نہیں ہوتا اور نتیجہ تدبیر نہیں تقدیر کی بدولت ہوتا ہے۔ لہٰذا تقدیر کا علم اگر پہلے

سے ہو جائے تو تدبیر کرنے میں بھی مزا آئے۔



زندگی میں ایک وقت وہ آجاتا ہے جب انسان موت کا انتظار کرتا رہتا ہے۔
پتھرائی آنکھوں کے سامنے کسی چہرے کے آنے کا مطلب پہلے ہی فوت ہو چکا ہوتا ہے اور
صرف موت ہی محبوب کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔



قلب و جگر کو محبوب سے ملاقات کے وقت فنا کے لیے تیار رہنا چاہیے۔
وہ فنا کے لیے مشتاق تو تھے اور اس امر سے بخوبی واقف بھی تھے کہ یہ وقتِ
ملاقات ان کا حشر کیا ہوگا۔ فنا کا علم ہونا اور اس کے لیے تیار رہنا ہی تو زندگی
کا راز ہے۔

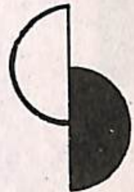


جسم کی رگوں نے اگر بہتے ہوئے لہو میں تپش پائی ہے تو اس کے سہارے
سے شباب پر شب خون مارنا چاہیے۔ اسی شب خون سے حیات کا تصوّر کوئی مشکل

ڈھالتا ہے اور یہی زندہ رہنے کا ایک واحد انداز ہے۔



کھڑکیاں اور دروازے تو سب ہی کُھلے ہیں لیکن ہوا کا ان میں سے گذر نہیں ہو رہا۔ یہ کیا عالم ہے کہ جینے کو طبیعت تو چاہتی ہے لیکن سانس اُکھڑی ہوئی ہے۔



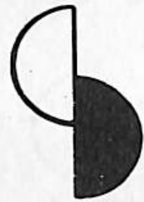
زندگی ایک مشکل سفر ہے جس کی صبح و شام بسر کرنا آسان کام نہیں۔ یہ وہ اندھیرا ہے جس کے بعد کہنے کو تو سحر ہوتی ہے لیکن اس کی روشنی مفقود رہتی ہے۔



فنا و بقا دو متضاد باتیں ہیں لیکن دونوں سے میری آشنائی ہے۔ موت کیا ہے، حیات کیا ہے میں نہیں جانتا، البتہ بُت خانے سے جب نکلتا ہوں تو سیدھا مے خانے کا رُخ کر لیتا ہوں۔



جب جسم سے جان نکل گئی تو انفاسِ مسیحا بے معنی ہو کے رہ جاتے ہیں۔ ہاں اگر یہ کارگر بھی ہو تو بھی تمام گذرے ہوئے ماہ و سال افسانے سے لگتے اور زندگی کا مطلب تلاش کرنا پڑتا۔



حاصلِ زیست کیا ہے؟ یہ ایک معمّہ رہا ہے اور رہے گا۔ آیا یہ ساحل ہے یا تلاطم؟ ایسا لگتا ہے کہ یا تو تجلّیِ حسن اپنا کرشمہ دکھائے گی یا پھر خدا کا نور ہی اُمڈ کر آئے گا اور مدّعائے حاصلِ زیست سمجھ میں آئے گا۔



ہستی کا راز تو راز، اس کی جستجو بھی عجیب و غریب کوشش ہے۔ اس جستجو میں نہ تو کچھ ہاتھ لگتا ہے اور نہ ہی پردۂ راز اُٹھتا ہے اور ہستی کا راز وہیں کا وہیں رہتا ہے جہاں کہ تھا۔



زندگی کی مجبوری سے جب میں راہِ فنا کی طرف روانہ ہوا تو میرے محبوب نے مجھے ذرا مہربانی سے دیکھ لیا۔ اس پر مجھے اس کی نیت پر شک ہوا اور یہ شک اِک ایسی شبِ مہتاب کو ہوا جب چاندنی نے عشق کرنے کے تمام تر راستے کھول دیے تھے۔



مسلسل بے قراری کے لیے زندگی میں ہمت کی سخت ضرورت ہے۔ کیوں کہ یہ بے قراری زندگی کا ایک جزو ہے۔ اگر کسی سے سوگواری کرنا منظور ہے تو خالی الفاظ سے کام نہیں چلے گا۔ اس کے لیے آنکھ میں ایک سیلاب کی ضرورت ہے۔



انسان کی کہانی ایک حکایتِ خونچکاں سے کم نہیں لیکن بُت کی قیامت گری صرف افسانے میں ہے۔ دونوں میں سے کون زیادہ پُر اثر ہے۔ انسان یا بُت ؟ حکایت یا افسانہ ؟ بتائیے



ایسا نہیں کہ بشر کی چیخ و پکار بے اثر رہتی ہے۔ اس کی کچھ بساط تو ہے، تبھی تو اس کے نالے پُر اثر ہو جاتے ہیں۔ آفتاب طلوع ہوتا ہے یا مہتاب سو جاتا ہے، یہ اُسی کے نالوں کی تاثیر ہے۔ دُنیا میں کچھ نظام قائم ہے۔ نالۂ دل بہ ذاتِ خود انسانی نظام کا ایک حِصّہ ہے۔



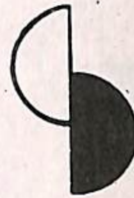
انسانی بدقسمتی کا کوئی اندازہ نہیں۔ ہر قدم پر اُسے جُستجوئے روزگار میں پھنسا رہنا پڑتا ہے۔ حالاں کہ صِرف گردشِ دَوراں ہی اسے تباہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ قدرت کا سلوک انسان کی بدقسمتی سے وابستہ ہے۔



زندگی اور موت کہیے یا یاس و اُمید ان کے درمیان اپنی لحد بننے تک جھگڑا جاری رہا۔ اور جب تک ہم خود مُشتِ خاک میں تبدیل ہو گئے اور ہماری لحد بن نہیں گئی ہم نے آپ کا بہت انتظار کیا۔



ہماری وفات پر آپ صفِ ماتم میں بھی شریک نہیں ہوئے اس کا کوئی غم نہیں۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ آپ نے ہمارے اس دنیا سے کوچ کرنے پر افسوس کا بھی اظہار نہیں کیا۔



میرا دشمن میرے دل کے تمام خفیہ رازوں سے بہ خوبی واقف ہے۔ ان واقعات کو ذرا آپ بیان کریں تو آپ کا شرحِ بیان غنچے کی طرح چٹک جائے گا اور میرے دل کے راز کی صورت کچھ اور ہو جائے گی۔



دنیا وجود میں آئی لیکن اس کے پیچھے کون سی مصلحت تھی؟ آیا لفظ "کن" کا تقاضا تھا یا آپ کا کوئی اعلان تھا کہ ایسا خمیر کھڑا ہو کہ جس میں رازِ حیات و ممات راز ہی رہ جائے۔



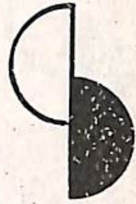
بے صبری یا بے قراری کی حالت میں موت کی دعا مانگی جاتی ہے، پر کیوں؟ کیا کوئی مرنے کے لیے تیار بھی ہے؟



کمال ہے انسان زندہ رہتے ہوئے بھی موت کو پکارتا ہے۔ جب ان میں سے کوئی زندگی سے صحیح معنوں میں دوچار ہی نہیں ہوا تب اُس کا موت کو پکارتے وقت کیا موت دوبارہ احسان جتانے آئے گی۔



عمر رفتہ یوں اُڑ گئی جیسے باغ سے تتلی گو ایامِ زندگی سمندروں کی تہ سے اُبھری تھی لیکن ان کی تیز رفتاری نے اس بات کا احساس ہی نہ ہونے دیا کہ کس طاقت نے نہایت فراغت سے تمام ماہ و سال چھین لیے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کی صدائیں و قہقہے غائب ہو گئے۔ بدبخت آنسو جن کی کبھی شنوائی نہ ہوئی۔



محبوب کا قرب حاصل کرنے کے لیے کون سی کاوش نہیں کی جاتی۔ یہ عین ممکن بھی ہے کہ اُس کا قُرب حاصل ہو جائے لیکن پروانۂ راہداری حاصل کرنے کے لیے پہلی شرط فنا ہونا ہے۔



اپنے نگہبان کی کون سلامتی نہیں چاہے گا اور کون اس سے مُروّت سے پیش نہیں آئے گا۔ میری اپنی دِلی خواہش یہی ہے کہ میرے نگہبان کو خدا سلامت رکھے کیوں کہ ایک وہی تو ہے جو کبھی کبھی بیگانگی کی ادا سے میرا گھر نذرِ آتش کر دیتا ہے۔



میں اتنا شیدائی بھی نہیں کہ بہار کے آتے ہی ہنسنا شروع کر دوں۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ جوں ہی فنا کی پرچھائیوں تلے میں زیرِ زمین گیا تو میرے اوپر ایک گلشن کِھل جائے گا۔ اس وقت جب بہار ہو گی تو وہ کِھلکھلا کر ہنسنے کا وقت ہو گا۔



نہ جانے کیوں بار بار دہرایا جاتا ہے کہ موت سے کسی فرد کو نجات نہیں۔ اگر یہ درست ہے تو زندہ رہنے کی پکار کبھی مایوسی کی طرف نہیں لے جاسکتی۔ اس پکار کو سن کر اور زندہ رہنے کے معاہدے کو آلام کی گرد سے بچانے کے لیے لازمی ہے کہ انسان تمام عمر کسی دیوار کے سائے تلے چلتا رہے۔



نہ جانے کیوں مجھے ہر" ناکردہ" جرم کا خطاکار ٹھہرایا گیا۔ شاید اس لیے کہ ایک بار ایک خواب کی لذتوں سے مایوس ہو کر مرنے کی تمنا کی تھی۔



جو بھی بول نکل سکتے تھے وہ نکل گئے اور میں انتظار میں مانندِ شمع پگھلتا رہا، جلتا رہا۔ آنسو بہاتا رہا اور آہستہ آہستہ اپنی سرکشی بھولتا رہا۔ یہ زندگی کی بے سود طوالت چوں کہ خلافِ فطرت تھی لیکن میرے جسم کی پکاروں نے اداس و مایوس ہو کر دم توڑ دیا۔



طوفان کے راستے میں بکھرے ہوئے سنگ وخشت اچانک شبنم کے موتیوں میں تبدیل ہو گئے۔ یہ لازماً کوئی فریب ہو گا۔ کیوں کہ تمام اندیشے اس پر غور کرنے کے لیے مجبور ہوئے کہ موتی بکھیرے کس نے ہیں۔



اس مختصر سی حیات میں سینکڑوں زخم احساس کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں۔ یہ سب ناہموار رشتوں کی بدولت ہے جب تک یہ رشتے استوار نہیں ہوتے جسم کے زخم نہیں بھر سکتے۔ ایسی حالت میں غمِ یاراں کا ذکر صرف اس لیے آتا ہے کہ کوئی نہ کوئی چشمِ حیران اس حقیقت پر خندہ زنی ہونے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ زندگی سوگواری کے عالم سے اُوپر اُبھرکے ہی نہیں دیتی۔



فردا میں کیا ہو گا۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا لیکن حال مانندِ زنداں ہے جو سانسوں کے آہنی سلاسل پر کھڑا ہے پھر بھی نوعِ انسان و چرند و پرند، خس و خاشاک اور کیڑوں مکوڑوں کا کوئی غمگسار پیدا ہوتا ہے جو ان زندان کے آہنی قفلوں پر احساسات کی سخت

ضربیں لگاکر زنداں کی عمارت کو اپنے آنسوؤں میں غرق کر دیتا ہے۔ اس سیلاب میں سے نئے نئے نغمہ گر پیدا ہوتے ہیں جو اپنے نغمے سنا کر پھر اسی سیلاب میں غائب ہو جاتے ہیں۔



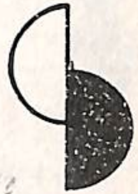
— لمحوں کے موڑ کبھی تو چہرے پر کفن ڈال دیتے ہیں اور کبھی شوقِ آوارگی میں اپنے کو خاکسار بنا دیتے ہیں۔ ان ہی موڑوں میں سے کبھی ایک پکار اُٹھتی ہے جو ہر شور کو صبر اور مناجات میں منتقل کر دیتی ہے۔

------------ ان موڑوں پر کئی زلیخاؤں کے گلابی چہرے دُھول میں مندمل ہو گئے اور کئی یوسف رُسوائے بازار ہوئے۔ موڑوں میں پستی بھی آتی ہے اور بلندی بھی۔ دَم بھرتا بھی ہے اور اُکھڑتا بھی ہے۔ ان موڑوں پر ہر شے ممکن ہے صرف وقت کا سازگار ہونا ممکن نہیں۔



ہر موقعے پر کراہنے کا کچھ نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ نہ دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے اور نہ اس کی شنوائی ہوتی ہے۔ یہ سب زندگی کے نشیب و فراز کا نتیجہ ہے جس کا حل کسی کے پاس نہیں اور نہ کوئی یہ راستے ہموار کرنے کی سکت رکھتا ہے۔ کچھ لوگ گڑھے بھرنے کی کوشش کرتے ضرور ہیں لیکن دوسری طرف مٹی کا ڈھیر ایک نئی صورت میں پیدا ہو جاتا ہے۔ کوئی اس دنیا

میں کیا روئیے کیا چلّائیے۔



اجل کا تو وقت مقرر ہے اور وہ صرف ایک بار ہی شب خون مارتی ہے لیکن مصیبت آدمی پر آتی ہے تو آتی ہی رہتی ہے۔ اجل سے نپٹنا تو پل بھر کا کھیل ہے لیکن سر پر پڑی مصیبت سے نبھانا بڑی سردردی کا کام ہے۔ ہاتھ کی لکیریں تو کچھ کر رُک جاتی ہیں لیکن مصیبت کی لکیریں نظر نہ آنے کے باوجود بھی چھبتی رہتی ہیں۔



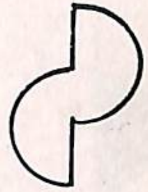
دنیا میں آمد و رفت کا ایک عجیب تماشا ہے جو کبھی ہنسنے پر مجبور کرتا ہے اور کبھی کھلکھلا کر ہنسنے پر۔ اسی تماشے سے رونے کی صدا بھی آتی ہے اور بلبلانے کی بھی۔ اس آمد و رفت کے گیتوں کو سنتے جاؤ۔ نہ ہنسو، نہ روؤ۔ چٹان کی طرح ایک جگہ کھڑے رہو اور معصوم آوازوں سے نہ خوف زدہ ہو اور نہ کسی کی لذّت سے محظوظ ہو۔





چراغ ولحد

خاک و خوں



دنیا کے سب نظارے جو زندگی کو دل کش بنائے رکھتے ہیں ایک سراب کی مانند ہیں جوانی کا جوش، حسن کی رعنائی و عاشقی کا کھیل ایک پھٹی ہوئی نقاب کے اُن چند تاروں کی مانند نظر آتا ہے جو کسی پر پردہ نہیں ڈال سکتا اور ہر شے بے نقاب نظر آتی ہے۔

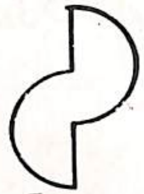


حدِ عقل میں یہ بات تو آسانی سے آجاتی ہے کہ سفینہ کیسے غرق ہوتا ہے، گرداب کیسے اپنے ساتھ ساحل کو لے جاتے ہیں۔ رات کی تاریکی میں شہر کیسے ڈوب جاتا ہے۔ یا کسی بے وفا معشوقہ کی گود میں نیند کیسے غائب ہو جاتی ہے لیکن طلسمِ وقت عقل کی سادگی کے شکنجے میں نہیں آتا لیکن وقت صبح و شام سے دوپہر و رات سے انفاس کی اُلجھنوں سے اور سر دُھنتے تقاضوں سے آشنائی ضرور رکھتا ہے۔



خوف کا عالم طاری ہو تو محسوس ہونے لگتا ہے کہ سر گردن سے جدا ہے اور کمر شکستہ ہو چکی ہے۔ ایسے میں انسان بے ساختہ پکار اُٹھتا ہے کہ میں اپنے کو مقابلے

کے لیے کیسے تیار کروں۔ ہمت اپنے چہرے سے فرار کا نقاب اُتارنے میں ناکامیاب رہتی ہے اور زمانہ محسوس ہی نہیں کرنے دیتا کہ سر گردن پر چسپاں بھی ہے یا نہیں اور خمیدہ کمر سیدھی بھی ہو گی یا نہیں؟



تمھاری کروفر میں آج تک کمی نہیں آئی اور تمھاری شان کے تیور کبھی اضطراب سے اُلجھے ہیں لیکن مجھے کسی نے یہ بتایا ہے کہ تمھارے چہرے کی ہر مسکراہٹ کسی ایسے بدقسمت برباد کی کہانی سناتی ہے جس کی لذّتِ غم ختم ہو چکی ہے اور جس کا دشت و صحرا کی گرم ہوائیں ذکر کرنا بھول گئی ہیں۔



لاکھوں چراغوں نے ایک بار مل کر کوشش کی کہ وہ ایک سحر کا سحر ختم کریں، لیکن یہ کوشش انھیں کسی منزل تک نہ پہنچا سکی۔ جب تمام چراغ ایک ایک کر کے بُجھ گئے، تب ایک سفاک سحر ان چراغوں کا ماتم کرتے نظر آئی۔ اس دوران کچھ اندھیرے جو لمسِ آفتاب کے دیوانے تھے وہ کھلکھلا کر ان چراغوں کی بے خود رُوحوں کو اپنے میں جذب کرتے رہے۔

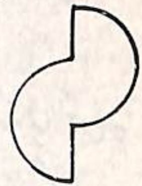


کسی دُور افتادہ قبر پر کبھی نہ کبھی کوئی دو پھول چڑھانے آجاتا ہے اور کبھی کبھی اسی قبر میں

دفن شدہ کے پارینہ قصّے ایک خوشبو کی طرح پھیل جاتے ہیں۔ شمع ہر روز جلتی ہے اور ہر روز ہزاروں پروانے اس پر نثار ہو جاتے ہیں۔ احباب انھیں دیکھتے رہتے ہیں اور غلطی سے بھی ان کے اس ایثار و قربانی کے جذبے میں مخل نہیں ہوتے لیکن شمع و پروانے کے قصّے اُن دونوں کے فنا ہونے کے بعد آکر کوئی سُناتا ضرور ہے اور اُن کی پُر اسرار زندگی ایک سبق بن کر اہلِ دل کو شرمندہ کرتی رہتی ہے۔



مجھے ایک مدّت سے دشت پیمائی کرتے ہو گیا تھا لیکن اس کا صحیح مفہوم میری فہم سے بالاتر ہی رہا تھا۔ اچانک میں نے شہرِ جاناں سے اُلٹ رُخ اختیار کیا تو دیکھا کہ میرا محبوب میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ میں نے سر سے خاک جھاڑی اور چہرے کو آستین سے صاف کیا۔ غور سے دیکھا تو ہم دونوں راستہ بھٹک چکے تھے۔ اُس کے ساتھ ایک ہجوم چل رہا تھا اور میں تنہا مسافر کی صورت لیے دشت پیمائی کرتا خراماں خراماں کسی اور طرف نکل گیا تھا۔



اپنا ضبط ختم ہوا اور عہدِ گذشتہ کی شکستوں نے اس وقت حملہ کیا جب ہم اپنی کشتی کو کسی ناخدا کے حوالے کر چکے تھے۔ ضبط کے خاتمے کے ساتھ ہی میں نے خدا کو درمیان سے ہٹا دیا۔ کشتی رواں دواں چل رہی تھی اور ناخدا اسے بہ خوبی کھے رہا تھا۔ خدا کا درمیان سے ہٹایا جانا تھا کہ محسوس ہوا کہ کشتی کے ساتھ ناخدا بھی ڈوب رہا ہے۔ میری آنکھوں نے یہ سب کچھ دیکھا اور پھر میرے بازو شل ہو گئے۔



گھر سے نکل کر واپس مُڑ کر دیکھنا تو منزل، رفتار و زندگی کے ہنگاموں کو قہر آلودہ نظر سے دیکھنا ہے۔ سامنے اجنبیوں کے جھمگھٹے ہیں۔ بَن پڑے تو اُسے انہی میں شامل ہو جانا چاہیے۔ زندگی کی آوارہ اُمنگوں کے پرستار اسی ہجوم میں ملیں گے۔ پلٹ کر گھر کی طرف دیکھا تو دیواریں اشک بہاتی نظر آئیں گی اور یہ وقت رونے کا نہیں بلکہ سہمے ہوئے اجنبیوں کے درمیان رقص کرنے کا ہے۔



کبھی کبھی مَوت کے بعد بھی عاشق کو ستم سہنا پڑتا ہے، تڑپنا پڑتا ہے۔ دیکھیے میری قبر میرے محبوب کی رہگذر کے قریب ہی بنا دی گئی ہے۔ جب وہ قریب سے گذرا تو جونہی اُس کا نقشِ پا میری نظر میں آیا یہ دل تڑپ کر مزار سے باہر آ گیا۔



محبوب کے آنے پر طوفان پُر اُمید ہے کہ اُس کا گھر نور سے بھر جائے گا۔ یارب اگر ایسا نہ ہوا تو اندھیرے کا اثاثہ اور ایک تاریک گھر ہی مقدر میں لکھا رہ جائے گا۔



کہتے ہیں پروانہ شمع پر فدا ہونا چاہتا ہے اس لیے جل مرتا ہے لیکن اصلیت میں پُروانے کا جلنا اِس کے مرنے کا ایک ایسا ہی بہانہ ہے جیسے مَوت کے آنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ بنتا ہے۔ ٹوٹا ہوا پیمانہ بھی کائنات کا ایک نمونہ ہے جو دراصل ایک شکستہ پیمانے کی ہمشکل ہے لیکن دیکھنے میں پُراز لذّت نظر آتی ہے۔



پُروانے کی زندگی میں جو غم ہائے نہانی کا سوز ہے اُس کی کیفیت کیا ہو سکتی ہے ؟ پروانہ تو عاشق ہوتا ہے شعلے کا۔ لہٰذا اگر دنیا میں عشق بھڑکتا بھی ہے تو اس کی زندگانی کی حد کیا ہے وہی جو پَروانے کے غم کے سوز کا ہے۔



میرے مزار پر کسی نے سوگواری کے عالم میں ایک شمع جلادی۔ رنج و اَلم سے دَبی ہوئی شمع غم زدہ ہو کر آخر کو بُجھ گئی اور اپنی تربت بے روشنی کے رہ گئی۔ جب شمع روشن تھی تُبت ضرور گورِ غریباں کی مانند تھا اور اب اندیشہ ہے کہ میرا مزار جلد ہی بے نام و نشان ہو کر رہ جائے گا۔



یادِ جاناں ایک عجیب اذیت ہے جو کسی صورت میں کم نہیں ہوتی ۔ تاریکی کا دَور دَورہ ہے اور شمع بُجھ چکی ہے لیکن یادِ جاناں بدستور آتی رہتی ہے ۔ یہ رات بھی عجب ہے جب اس کی غم گینی گذر جائے گی تو ہمارے مقدّر میں اور تو کچھ نہیں صرف ایک سحر ہو گی جسے بہتر حالت میں بَسر کرنا ہو گا۔



تمہیدِ حُسن ایک انتہائی بیداد کی ذمّہ دار ہے اور تمہیدِ عشق جان لیوا ہے ۔ ایسی حالت میں مرگِ ناگہانی کی خواہش پیدا ہوتی ہے جو آنے میں نہیں آتی صرف لے دے کے چارہ گر مقدّر میں رہ جاتا ہے ۔



اگر ناقہ لیلیٰ کوئی نقشِ پا دشت کی وسعتوں میں چھوڑ جاتی تو ہو سکتا تھا کہ کچھ تسکین ہوتی لیکن ایسا نہ ہوا اور ساری رات دشت میں آوازیں لگاتے نکل گئی ۔ اب تو صرف ایک قیامت کی سحر مقدّر میں رہ گئی ہے جو ابھی طلوع ہونی ہے ۔



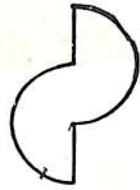
اُمید کبھی کبھی ڈھارس بندھاتی تھی لیکن اب کے یاس کے غلبے نے ایسا ہونے نہ دیا۔ نہ معلوم میرے تمام درد مند کہاں چلے گئے ہیں۔ اب تو ایک نالۂ بے اثر مقدر ہو کر رہ گیا ہے۔



کاروانِ زیست نہایت ہراسانی کی منزلوں سے گذرا اور اس دور میں بستیِ دل اُجڑ کر رہ گئی۔ کیا کیا جائے۔ نگاہِ لطف ختم ہوئی تو صرف ایک عمر ہی مقدر میں رہ گئی۔



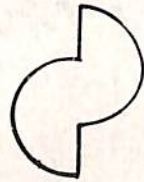
ہماری زندگی میں کوئی قافلہ ایسا نہیں آیا جس کے ساتھ ہم نے چند قدم نہ چلے ہوں۔ منزل مقدر میں نہیں۔ ہاں مقدر میں صرف سفر لکھا ہے۔ اس سفر میں کوئی ہم سفر ہمارے ساتھ نہیں ایک راہ رو ہے جو چل رہا ہے۔ وہی ہمارا مقدر ہے۔



میرا نشان ڈھونڈنے والوں کو میری لحد سے بھی میرا نشان نہ مِلا۔ میری لحد تو تیری رہگزر کے پاس تھی اور میں تیری رہگزر کا پاسبان تھا لیکن اب جب میرا نام و نشان ہی مٹ گیا ہے تو تیری رہگزر کی پاسبانی کیسے ہو!



میرِ کارواں کا منجھا ہوا سالار تھا اور اس کی راہنمائی کی بدولت کئی لوگوں پر بے شمار عنایات ہوتی تھیں لیکن جب قافلہ لُٹ گیا تو اس کا الزام کس پر رکھیں۔!



ایک شام منزل کے قریب ہی لیلیٰ لُٹ گئی ـــ اس کا محمل بھی لُٹ گیا۔ اسی لُٹنے کی شام کا ذکر کر کے اب سفر کرنے والوں کو لطفِ سفر آنے لگا۔



شمع کی طبیعت تو ایک ہی جیسی رہتی ہے چاہے وہ سجی ہوئی بزم میں ہو یا کسی کے

مزار پر روشن ہو۔ میرے محبوب کی لاش بھی اسی طرح ایک جیسی ہی ہے۔ ان کا نہ کبھی سلام آتا ہے اور نہ کبھی پیغام۔



گرداب میں کشتی پھنسی ہوئی تھی۔ چاروں طرف نہ تو خدا نظر آیا اور نہ ناخدا ہی۔ پھر کشتی کو ساحل پر لانے کا کس نے اہتمام کیا؟



موجیں عجب اضطراب میں تھیں، وہ ساحل سے ٹکرائیں، اچھلیں اور انھوں نے مجھے ساحل سے اٹھالیا۔ یہ تقدیر کا کھیل تھا جو میری تدبیر سے غافل نہ تھی۔ تدبیر تو یہی تھی کہ موجوں کا تماشا دیکھا جائے لیکن تقدیر میں گرداب لکھا تھا۔



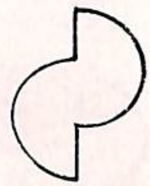
ہر مزار کا دنیا سے نام ونشان مٹ جاتا ہے۔ خیال تھا کہ لحد کے تعمیر ہونے سے نیست ونابود ہونے کی مشکل دور ہو جائے گی اور نام کہیں نہ کہیں رہ ہی جائے گا۔ میرا مزار ان کی راہ گذر میں تھا وہ ٹھوکروں سے اڑادیا گیا۔



وفا پرستوں کی یہ مجبوری تو ضرور رہے گی کہ انھیں تکمیلِ آرزو سے دوچار نہیں ہونا پڑتا یعنی انھیں لذّتِ منزل کبھی حاصل نہیں ہوتی۔



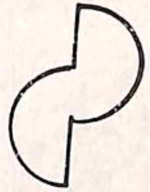
مجنوں کی فطرت کی صحیح ترجمانی یوں کی جاسکتی ہے کہ وہ اس بات کی ضامن ہو کہ اُس کی اپنی بے قراری کی طرح خورشید و انجم اُن لوگوں کی جوکسی کرتے رہیں جو اپنی حالت سے بے خبر ہیں۔



میری بے بسی قابلِ دید ہے کیوں کہ مَرنے کے بعد میری لحد کسی بھی رہگذر میں شامل نہیں اور اتنی دُور افتادہ ہے کہ کسی رہگذر کی نظر اس پر پڑ ہی نہیں سکتی اور وہ تنہا لاچارگی کی حالت میں پڑی راتیں کاٹ رہی ہے۔



ان کی تدبیر جو رہگذر پر چلنے کے عادی ہیں تقدیر کے مدِمقابل آنے سے ہمیشہ جھجکتی ہے۔ کیوں کہ ہر رہ گذر پر آپ کو ہمیشہ چند لوگ بھٹکتے نظر آئیں گے۔ بھٹکنا ان کی تقدیر میں رقم تھا، حالاں کہ وہ رہگذر پر سیدھا چلنے کی تدبیر بنا رہے تھے۔



میری تربت پر ایک چراغ کسی نے جلا دیا تھا لیکن میرے محبوب نے ادھر سے گذرتے ہوئے بھی ایسی بے رخی اختیار کی کہ اُسے وہ چراغ نظر ہی نہیں آیا۔ میری ناکام تمنا اس کی دل لگی کا سامان بن کر رہ گئی۔



وفا کا نتیجہ اکثر ستم آرائی کا مظاہرہ کرتا ہے اور اگر یہ ایسا ہے تو بے وفائی سے کیا کیا نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں کشتی نے ساحل پر لوٹنا تھا اور اگر وہ نہ آئے تو اس کے ناخدا کو کیا کہیے گا؟ جلوہ گاہِ وصال میں ایک شمع خاموشی سے جل رہی تھی کہ کسی نے اچانک اسے بجھا دیا اور تاریکی چیخیں مارنے لگی۔ شمع گل کرنے والے کو کس نام سے پکاریے گا؟



دشت و صحرا میں شہروں کی روشنی سے راستہ نہیں ملتا۔ البتہ اِکّا دُکّا کھوپڑی نظر آجاتی ہے۔ منزل اگر موہوم ہو تو بھٹکنا لازمی ہے۔ اسی طرح میں بھی مسرّت کی چھاؤں تلے اپنے راستے پر گامزن تھا کہ اچانک پاؤں رُک گئے اور دیکھا کہ میں ایک بھرے بازار کے بیچ کھڑا ہوں۔



وفورِ شوق میں شمع خود ہی اپنا مرثیہ پڑھتی رہی اور آہستہ آہستہ اُس کا جسم نیند کے کوڑے کھا کر اتنا شل ہو گیا کہ ضعیفی کی حالتِ بے چارگی میں وہ لاچار کسی کے انتظار میں زمین سے چمٹ کر سو گئی۔



مکین کون ہے اس دنیا میں اور یہ مکان کس کا ہے۔ خدا جانے کیا ماجرا ہے کہ آدمی مکان میں جاتا ہے اور پھر خود ہی کوئی احساسِ شکست لیے ہوئے باہر نکل آتا ہے۔ اور سڑک پر چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ کبھی کبھی برسوں اس مکان سے باہر رہتا ہے۔ اکثر اس مکان کو بیابانِ سنسان پاتا ہے اور اسے بھوتوں کا مسکن سمجھ کر اپنے مکان سے ہجرت

کرجاتا ہے ۔اس مکان کا کوئی مکین نہیں ۔اس میں ہر جلے چراغ کے نیچے داغ ہیں جو آنسوؤں سے دُھل نہیں سکتے ۔خبردار ان اینٹوں کے انبار کا احترام نہ کرنا ورنہ کسی دن یہ تمھارے سر پر آن گریں گی اور تمھاری تربت کہلائیں گی۔



کبھی ہمارا پرہیز و تصوّف وفا تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ہم ہی وفا کے موجد ہیں اور اس کی حفاظت کے ذمہ دار بھی ہم ہیں۔ اب بے وفائی کے مراقبے میں پڑا ہوں کیوں کہ یہی ہماری نگہبان ہے۔ یہی زندگی کے ہر موڑ میں راس آتی ہے۔ وفا کا تصور بھی عنقا ہو چکا ہے۔



میں موجِ حوادث کی ہر جنبش پر مطمئن ہوں اور حیران بھی۔ یہ اپنے انداز میں اُبھرتی ہے لیکن ساحل کو اپنے ساتھ نہیں لے جاتی۔ اُسے وہیں کا وہیں چھوڑ جاتی ہے۔ اگر تو ساحل کو ڈبونے کی خواہاں نہیں تو اپنے تمام رازوں کو افشاں کر دے اور اپنے جلال کو انکساری کا سبق دے۔



کیا پروانے کا ضمیر اُسے فنا ہونے پر مجبور کرتا رہتا ہے یا اس کے بدن میں کسی حرارت کی کمی ہو جاتی ہے جس کے حصول کے لیے وہ شعلے میں جذب ہونے کی تڑپ لیے گھومتا

ہے۔ پروانہ خودکشی کا متلاشی نہیں۔ البتہ شمع رو رو کر ویسی شعبدے بازی اختیار کرتی ہے کہ پروانہ عشق کا دعوے دار شمع کی پہلی ہی درخواست پر جل جانے کو تیار ہو جاتا ہے۔



عشق کی طویل مسافت طے کرنے کا کام میں نے شروع کیا ہی تھا کہ صحرا کے ایک ذرّے نے اس کا استقبال اپنی تپش سے کیا۔ یہ وہ ذرّے تھے جنھیں میں اپنے عشق کی ادائگی میں خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ انھوں نے آج اُسے لبیک کہا اور اس کی بے پروائی کا بدلہ چکانے لگے۔



میرا کوئی مقام تو اس دنیا میں ضرور ہوگا تبھی میری جبیں سے سنگ وخشت کو چوٹ آئی۔ اس خفّت کو مٹانے کے لیے میں نے ہر چیز سے سر پھوڑنے کی ٹھہرائی اور جب کوئی اور شے دستیاب نہ ہوئی تو آخر میں ایک بچی دیوار سے سر ٹکرانا مناسب سمجھا۔ وہ بھی میری قلندری کی چوٹ سے پارہ پارہ ہوگئی۔



میں ایک طویل سفر پر نکلا تھا اور مجھے کسی ہم سفر کی ضرورت محسوس ہوئی یہ ان کا کرم تھا کہ انھوں نے میری اس پیش کش کو منظور کیا اور میرے ساتھ سفر کے لیے آمادہ ہو گئے۔ میرا دل بَلّیوں اُچھلنے لگا اور جب دورانِ سفر انھوں نے میرے ارادوں کو بھانپ لیا۔ تب ان کے

پاس اس کے علاوہ اور کیا چارہ ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے تنہا چھوڑ کر کہیں اور نکل جاتے۔ ہم سفر آسانی سے نہیں مِلا کرتے۔



زندگی کی نامُرادی کو گلستان میں ایک دشت درکار تھا۔ اِدھر اُدھر کچھ در و دیوار کھڑے تھے کہ اچانک وہ گر پڑے اور محسوس ہوا کہ امید میں کچھ ضیا باقی تھی جو دشت کی وسعت کے ساتھ چمکنے لگی۔



میں خاک نشین ہوں اس پر بھی کوئی خاک نشینوں کا اعتبار نہیں کرتا جیسے مجھے الگ الگ وقتوں میں الگ الگ ناموں سے بلایا جاتا ہے ویسے ہی درویشوں و خاک نشینوں کی بے اعتباری کی بدولت ان سے کرامات دکھانے کو کہا جاتا ہے جیسے خاک نشینی کوئی کرامت نہیں۔



دل کی ضد کا دامن تھامے ایک دیوانہ دشت و بیابان کے سفر میں سرگرداں تھا۔ صحراؤں کی راہ گزر سے نہ جانے کیسے بہار کا ایک جھونکا انتہائی مستی کی حالت میں گذرا اور دیوانے کی ضد کا منہ چڑانے لگا۔ گلاب کا ایک پھول کہیں سے اڑتا ہوا آیا اور دیوانے کے قدموں میں جا گرا۔ پھر کیا تھا آنسوؤں کے سیلاب سے صحرا بھیگ گیا۔



ایک آنسو قطرۂ شبنم کی طرح دامن پر گرا لیکن کچھ بول نہ سکا۔ زندگی کے سنّاٹے میں رونق کا بازار گرم کرنے کے لیے ساز کے بولوں کی ضرورت تھی۔ اچانک آنسوؤں کی ایک لڑی نے اُڑتی ہوئی صداؤں کو ایک ساز میں منظم کر کے وہ گیت چھیڑے کہ محفلوں کے ہنگامے خاموش ہو گئے۔



آغازِ شب میں مٹّی کے ایک دیے کا جلایا جانا ضروری ہو گیا کیوں کہ اس سے قبل جتنے چراغ جل رہے تھے وہ سب ایک ننھی سی یاد کی تند ہوا نے بجھا دیے تھے۔



غمِ ہجراں میں گریاں طوفان کی زندگی کا ایک لازمی جزو بن گیا تھا اس کے باوجود بھی اسے تنہائی کا علم نہ تھا کیوں کہ وہ اکثر سایۂ دیوار کے نیچے بلکتا رہتا تھا۔ جب ایک دن وہ دیوار گر گئی اور سایۂ دیوار کا رشتہ چھوٹ گیا تو معلوم ہوا کہ جدائی کیا ہوتی ہے!



مسلسل وقت کو اگر کوئی بانٹ سکتا ہے تو وہ ہیں صدیاں۔ صدیوں کو بھی لمحات

آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ یہ لمحے جو وقت کے قافلوں کو نیست و نابود کر دیتے ہیں۔ پھر نہ جانے کیوں درد اور صدمات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔



میں اپنی سرزمین سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوا۔ عوام نے مجھے مہاجر کا خطاب دے دیا۔ مسافرت کے تمام راستے میں مجھے لاشوں کے انبار نظر آئے جن کی تربتیں گھڑتا گھڑتا میں سن رسیدہ ہو گیا۔ میرا سر زندگی کی لاش کی طرح جھکا رہا اور جوں ہی کبھی مجھے سر اٹھانے کی فرصت ملی مجھے امنڈتے ہوئے صحراؤں کے نشان نظر آنے لگے۔





فراق و وصال

آہ و بکا



شکووں کی توہین اس وقت ہوتی ہے جب وہ صورت ڈھال کر لب تک آپہنچتے ہیں۔ شکووں کی توہین نہ صرف رُوح کو برہنگی عطا کرتی ہے بلکہ ٹھوکریں کھانے کے بھی تمام سامان بہم پہنچاتی ہے۔ ایک دفعہ کی ٹھوکر نہ صرف دُوریاں پیدا کرتی ہے بلکہ خود کسی نہ کسی سوچ میں اور جذبات کی رسمِ وفا میں تبدیل ہو جاتی ہے کارخانے سے نکلی ہوئی برف کے ٹکڑے کی طرح سخت شکل اختیار کر لیتی ہے۔



وہ نامُراد ساعت تھی جب سینکڑوں سر قلم ہوئے لیکن جب خزینۂ ہمت میں حیرت انگیز اضافہ ہوا جب ایک بھی سر کوئی شہریار جھکا نہ سکا اور اس کے ہاتھوں جو سر قلم ہوا بزمِ دنیا میں رنگینی بکھیرتا گیا اور مُردہ دِلوں کو تسکین بخشتا رہا۔ سنتے ہیں ایک دن اُس شہریار کا سَر قلم کر دیا گیا اور زمانے کا دستور بدل گیا۔



میں نے اگر دامن پکڑ لیا ہے تو تیرا اسے چھڑا لینا ایک مشکل امر ہے۔ یہ اُس صورت میں ہو سکتا ہے کہ تم نظر بچا کر کہہ دو کہ تمھیں میری تھوڑی سی ضرورت ہے۔

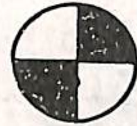


میں نے اپنے تمام غموں کو اپنا ایک رازدار سمجھا تھا۔ یہ رازدار تمھیں تھے۔ کیوں کہ جب میں اپنے غم بیان کر رہا تھا تو تم نے تسلّی و تشفّی اس طرح دی جیسے تم واقعی میرے

راز دار رہو گے۔ اب تم نے میرے تمام راز ہر سانس کے ساتھ ہر رہ گذر پر بکھیر دیے ہیں۔ اور تو اور تمھاری زلفوں کے سائے میں جو سانس لیا تھا اس کا نام بھی زبان زدِ عام کر دیا ہے۔



آپ کو راز خفیہ رکھنے کی ضرورت تو تب پڑے، اگر آپ جو کہیں وہ نہ کریں اور وہ کریں جو کہیں نہیں۔ اگر یہ ضرورت پڑتی ہے تو کیوں! تمھارے قول و فعل میں ایک آسمان کی گنجائش ہے مگر کیوں؟ میں نے کبھی آپ کو اپنے جاں نثاروں میں تسلیم نہیں کیا اور نہ آپ سے کبھی ملاقات کرنے کے لیے اصرار کیا ہے۔



محبوب میرے بلانے پر نہیں آیا۔ وہ عشق کے تمام رشتوں کو استوار کر کے آیا اس میں ہماری وہ رُسوائی اور دنیا میں اس کی وہ چرچا ہوئی کہ رنج و محن کا ماحول ہی بدل گیا۔



عشق کا امتحان ماسوائے بے وفائی کے اور کوئی لے نہیں سکتا۔ اس امتحان کے دوران پاؤں ایسے اُکھڑتے ہیں کہ اپنی زندگی کی انجمن کا انداز بدل جاتا ہے۔



مجھے اے میرے محبوب اجنبی مت سمجھو۔ میری طرف یوں دیکھو جیسے میں تمھارا ہی عکس ہوں، یا تمھاری ہی تصویر ہوں۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ تم میرے دل میں آؤ، آتے رہو اور جاتے رہو۔ ہم اُن میں سے نہیں جنھیں آپ کے جانے سے

اذیت ہو اور آنے پر مسرت ۔ میں تو آپ ہی کا دوسرا رُخ ہوں اس میں اجنبیت کی کوئی گنجائش نہیں ۔



کسی بھی منزل تک پہنچنے کی سینکڑوں راہیں ہوتی ہیں اور اگر منزل پہ نہ بھی پہنچا ہو تو بھی ان راہوں کی کمی نہیں لیکن یہ بات ابھی تک طے نہیں ہو پائی کہ دل اور وہ بھی کسی کی اُلفت میں پھنسا ہوا ایک ہی رہ گذر پر کیوں بھٹکتا رہتا ہے ۔



حسن کبھی صاف گوئی سے کام نہیں لیتا اور عموماً غلط فہمی اسکی بدولت پیدا ہوتی ہے حسین اپنے اوپر نہ الزام لیتا ہے اور نہ ہی دروغ بیانی کرنے سے جھجکتا ہے حسن کو مکرنا آتا ہے اور وہ موقع محل دیکھ کر فوراً مکر بھی جاتا ہے۔ حسن کی حدیث میں جان و ایمان آزمانے کے سب نسخے موجود ہیں ۔

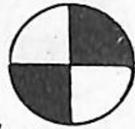


نگاہِ شوق کی بدولت عشق کے امتحان ہوتے رہتے ہیں لیکن اس عشق کی ہستی کیا ہے ؟ کیا اسی وجہ سے سینے میں رہ رہ کر درد اٹھتا ہے جو نہ جانے کب ایک مہلک ٹھیس پہنچائے گا ۔

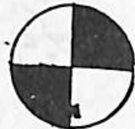


حسن کے لمحے بھی کچھ زیادہ نہیں اور نہ عشق کی گھڑیاں طویل ہوتی ہیں۔ آنکھ جھپکنے میں دونوں کی زندگی ختم ہو جاتی ہے ۔ اگر یہ بات سچ ہے تو یہ عمرِ جاودانی کی حکایت کے جادو کا

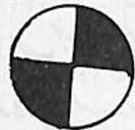
قصہ کیوں بیان کیا جاتا ہے۔



بڑی مشکل سے کوئی محبوب اپنے حبیب کے افسانۂ غم کی وجہ جاننا چاہتا ہے۔ مجھ سے جب میرے محبوب نے وجہ پوچھی تو میں مسکرا دیا۔ یہ مسکراہٹ غمِ دل کی نشانی ہی تو تھی۔



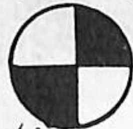
بے وفائی کا رشتہ حسن سے منسلک ہے۔ بے وفائی کے اپنے انداز ضرور ہوتے ہیں لیکن انھیں بھی کب تک برداشت کیا جا سکتا ہے اور اگر طاقتِ برداشت ختم ہو چکی ہے تو حسن کو آخری خدا حافظ کہنے میں کیا حرج ہے؟



جب دل اختیار سے باہر ہو جاتا ہے تو غمِ دل اور بھی قابو سے باہر ہو جاتا ہے اس لیے میری فریفتگی کو جو دراصل غمِ دل کا ہی حصّہ ہے تمھاری مہربانیوں کا اعتبار مات نہیں دے سکتا۔



بے شک اُس نے مجھے بھلا دیا ہو لیکن میرے دل سے اس کی یاد نہ مٹ سکی۔ وہ تو میں کسی جذبے کے تحت صبر میں ڈوب گیا۔ ورنہ میری بے قراری بدستور مجھ پر حاوی رہی۔

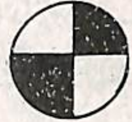


عشق کی اپنی رسم و راہ ہوتی ہے جس سے آسمانی فرشتے بہ خوبی واقف ہیں۔ یہ گُل انہی کے کھلائے ہوئے ہیں۔ ان فرشتوں کی کہانی بھی اتنی ہے کہ یہ سب عشق کے اصولوں سے

واقف ہوتے ہوئے بھی تجھی پر فریفتہ ہیں۔



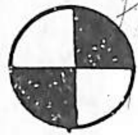
محبت کے میدان میں قسمت آزمائی کے کئی نمونے سامنے آتے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میرے دامن پر خون کی دھار بہنے لگی۔ یہ خون میری رگوں سے اُمید کے نشتروں نے زخم پہ زخم لگاکر نکالا تھا۔ وہ خون کا رنگ مجھے ابھی تک یاد ہے کیوں کہ اس سے زیادہ دُنیا میں کوئی اور رنگین شے دیکھنے میں نہ آئی تھی۔



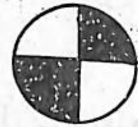
نہیں کوئی جواب نہیں۔ وقت کے ماتھے پر پڑی شکنوں کا کوئی جواب نہیں انھوں نے ایک آنیوالے عالمِ مہرووفا کی خوشبو کو چھین کر غموں کے نشتروں کا انبار لگا دیا اور وہ بھی میرے ہی گھر کے باہر۔ یہ شکن زدہ چہرہ اگر بدل دیا جائے تو میرا اچھنا ہوا یقینِ وصال یقیناً مل جائے گا۔ وصال نہیں یقینِ وصال۔



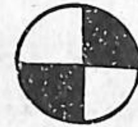
جہاں کہیں میرا نام لیا جاتا ہے وہاں غمِ جاناں کا بھی ذکر آتا ہے۔ یہ ویسے ہی ہے جیسے کہیں بھی اور کبھی بھی رُوح و جسم کا تذکرہ ہو یا بلندیٔ تخیل کو خراج دیا جائے۔ غمِ دوراں کے بغیر بحث مکمل نہیں ہو پاتی۔ غمِ جاناں کے ذکر کے ساتھ جہاں میرا نام آیا وہاں میرے عشق کا بھی ذکر ہوتا ہے جو اَب کسی کے لطف و کرم کا ممنون نہیں۔



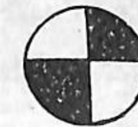
محبوب کے آنکھ سے اوجھل ہونے پر چمن کی رنگت بدل جاتی ہے اور چمن کی رنگت کے ساتھ ہی کانٹے و خاشاک بھی اپنی زندہ رہنے کی ہوس چھوڑ دیتے ہیں۔ محبوب کے جانے سے چمن کا لطف ہی بدل جاتا ہے۔ نہ پھول میں خوشبو رہتی ہے اور نہ کانٹے میں چبھن۔



دل کے سونپنے کے بعد آہ و فغاں کی کوئی وجہ نہیں رہ جاتی ہے۔ طوفان اگر روتا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس کا دل اُس کے سینے میں نہیں رہا بلکہ اس کی تنہائی کا بوجھ بڑھ گیا ہے۔



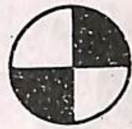
بے معنی آہ و فغاں کرنا خصوصاً جب اس میں تاثیر نہ ہو ایک مہمل سی بات ہے۔ ایسی تمنا کو یوں پرکھنا چاہیے کہ اس کی تکمیل کے لیے جو سینہ کوبی ہوگی اس میں تاثیر کتنی ہے۔ بے وقت کی راگنی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔



عشق کا خطرہ معمولی خطرہ نہیں کسی آدمی کا عشق میں گرفتار ہونا تلوار کے سائے تلے سونے کے مترادف ہے۔



تمنّائے وصال نے طوفان کو بہت ذلیل وخوار کیا۔ ہزار کوششوں کے باوجود وصالِ صنم ممکن نہ ہو پایا۔ تیرے ہر نقش پا پر سجدہ بھی ممکن نہ تھا اور اگر یہ کرتے بھی تو بھی تمنّائے وصال تمنّا ہی رہ جاتی۔



اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے وعدہ کیا اور کسی کو پشیمانی اُٹھانی پڑی۔ وعدہ و پشیمانی دو الگ الگ صورتیں ہوگئیں۔ اگر ایسا تھا تو آپ کو وعدہ کر کے کسی کو بیمار کرنے کی ضرورت کیا تھی۔



تم نے جُرم کا اقبال کیا تو ہم نے معاف کر دیا کیوں کہ تمھیں جُرم کرنے کے لیے اُکسانے کا کام خود ہم نے کیا تھا۔ تمھارا جُرم ستم کرنا تھا اور ہم نے تمھیں ستم سے آشکار کیا تھا۔



لفظِ محبّت کا آغاز عہدِ شباب میں ہوا تھا لیکن پیری تک یہ ہمیں شرمسار کرتا رہا۔



میری مانگ صرف ایک بوسے کی تھی۔ اس پر یہ تیور تو بہ۔ مجھے تو صرف یہ پرکھنا تھا کہ حشر تک اس کی طلب سوائے میرے اور کس نے کی ہے۔



عشق نے وفا بھی کی اور محبوب کا اعتبار بھی گیا اور یہ سلسلہ ایک بار نہیں بار بار ہوا۔



لازمی ہے کہ مینے آپ کا کچھ ضرور بگاڑا ہوگا تبھی تو آپ نے مجھے اس طرح سے بے قرار کیا ہے۔



بے شک میرا قصور یہی تھا کہ میں لفظ "ستم" کا مفہوم نہ سمجھ سکا ورنہ آپ کی ہر خفا نے مجھے پہلے ہی سے آگاہ کر دیا تھا کہ ستم ہونے والا ہے۔

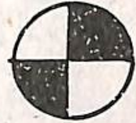


ازل سے ابد تک کی کہانی میری ہی داستان ہے۔ اس میں بدگمانی کی گنجائش

نہ تھی لیکن جوں ہی ایک شمہ بھر بھی گنجایش ہوئی عشق کی رسوائی شروع ہوگئی اور میری داستان کو عنوان ملنے شروع ہوگئے۔



وصال کے خیال کا کوئی جواب نہیں۔ زندگی میں کیے گئے میرے سجدوں کے جتنے نشان باقی تھے وہ خیالِ وصال کی بدولت مٹ گئے۔ اور وہ اس لیے کہ دل وسعتِ خیال کا نمونہ ہوگیا اور نظر کی حد آسمان کو چھونے لگی۔



میرے عشق کے یہی آثار باقی رہے کہ چاروں طرف ایک خامشی سی طاری رہی۔ عشق عشق تھا، نہ یہ مجازی تھا اور نہ یہ حقیقی۔ کیوں کہ یہ دونوں صورتیں ہی باطل ہیں۔



محبوب آیا اور چلا گیا۔ اس کی روانگی پر آنکھ گورِ غریباں کی طرح ہو کر رہ گئی لیکن جب وہ آیا تھا اس وقت زبان کی شہادت ہوگئی تھی۔



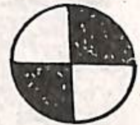
زندگی کے ایک وقت میں دل عقل کی بات نہیں سنتا اور ایک وقت ایسا ہوتا ہے جب عقل دل کی نگہبانی نہیں کرتی۔



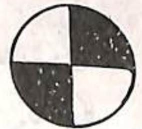
عشق کا اختتام وصل کی رات کو ہوتا ہے لیکن اس رات اُس کا اضطراب بھی عروج پر ہوتا ہے۔ کیوں نہ ہو آخر یہ ملاقات ان تمام برسوں کی بلا وجہ ریاضت کا نتیجہ ہے جو گذر چکے ہیں۔



رات کی دُلہن جب شباب پر آئی تو اُس نے اپنا لباس اُتار دیا اور ستارے اسے عُریاں دیکھ کر مسرّت سے جھُوم اُٹھے۔ ان کا سانس پھُول گیا اور ہاتھ پاؤں میں لرزہ سا آگیا۔ وہ کریں کیا۔ انھیں خنک ہَوا کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ کسی کا عریاں شباب دیکھ کر پسینہ آ ہی جاتا ہے۔



رات کا اپنا ایک جادو تھا اور اُس رات عشق کی لپٹیں بھی آ رہی تھیں۔ تمام رات یہی دعائیں مانگتے بسر ہو گئی کہ رات طویل ہو جائے، لیکن کتنی؟ آخر صبح کی پو پھٹی تو کائنات کا جادو ایک ہی سحر کے طلوع ہونے سے غائب ہو گیا اور عشق نے نئی منزلیں طے کرنی شروع کیں۔



وہ آ تو گئے لیکن خاموشی اختیار کیے بیٹھے رہے۔ میرے تمام گلے شکوے و شکائتیں جنھیں کہنے کے لیے میں تڑپ رہا تھا۔ اسی خاموشی کے نذر ہو گئیں اور میں بھی خاموش رہا۔

اس لیے کہ لمحوں کا احساس اس خاموشی نے اُدھار لے لیا۔



میری پریشانیوں کے قصّے طول پکڑتے جا رہے ہیں لیکن انھیں سننے کے لیے کوئی تیار نہیں۔ کاش کہ کوئی میرے ان اشکوں کو لے جا کر انھیں کسی کو سنائے اور اگر وہ میری ہمّت لے کے راضی ہو جائے اور غم گساری کے لیے آنا چاہے تو غارت گر کے لیے درِ دل کھول کر رکھوں۔



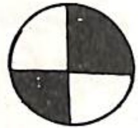
میرے کتنے رقیب ہیں میں نہیں جانتا لیکن میں یہ بخوبی جانتا ہوں کہ میرے محبوبِ خوش شکل کے شہر میں کئی پرستار موجود ہیں میں ان سے نفرت بھی کرتا ہوں اور انھیں دیکھنا بھی چاہتا ہوں تاکہ میری حیثیت میرے سامنے آ جائے۔ ایسی حالت میں جب یہ خبر آتی ہے کہ ان کے در بام سے آج چلمن ہٹے گی اور ان کا دیدار حاصل ہوگا تو مجھے بھی تذبذب کی حالت میں یہ دیکھنے کے لیے وہاں جانا پڑتا ہے کہ اس بہانے سے مجھے اپنے محبوب کے چاہنے والوں کا پتہ چل جائے۔



عشق میں ایک عجیب سا تضاد رہتا ہے۔ محبوب کی کوشش یہ ہے کہ ہر حالت میں خاموشی برتی جائے تاکہ کوئی غلط بات مُنہ سے نہ نکلے اور عشق کی رُسوائی نہ ہو لیکن عاشق کا یہ طور ہے کہ وہ پیدل چل کر کوئے دلدار میں چکّر لگائے اور رسوائیِ عشق کی پروا کیے بغیر اپنے دلدار کو دیکھ تو آئے۔



اجنبی کے لیے اجنبی رہنا ہی بہتر ہے۔ قصہ تھا ایسے شخص کے لیے جو خود اپنے کو بے یار و مددگار اور تنہا پاتا ہو اور کسی صورت میں اپنے محبوب کو محبّت سے پکار بھی نہ سکتا ہو۔ یہ اجنبی اپنے یار کو دُور سے ہی دیکھ لے' اِس کے لیے یہی کافی ہے۔



سفر کا ارادہ کرنا اور بھی کسی بڑی مہم کو سر کرنے کے لیے بہ ذاتِ خود ایک مقامِ فخر ہے اور اسی ارادے پر مجھے ناز ہے۔ ہاں وہ بات الگ ہے کہ منزل کی طرف ایک قدم بھی نہ اُٹھ سکے۔ اس سفر کے ارادے کا آغاز وہیں سے شروع ہوتا ہے جہاں میں اور میرا عشق بدنام ہوئے تھے۔



حالتِ وصل میں بھی اُن کی زلفِ دراز مجھے ڈسنے سے مُنکر رہی۔ میرا شکوہ اپنی جا پر بدستور قایم رہا کہ میرا انھیں نہ ہونے میں کیا اعتراض ہے! وصل کے بعد بھی مر مٹنے کی جو لذّت کی فرازی حاصل ہونی چاہیے تھی وہ کیوں نہیں ہو پائی۔



دنیا میں جسمانی امراض کے تو بیشتر لوگ شکار ہیں لیکن ان میں سے چند محض عشق کے

بھی لاحق ہیں۔ شفا بہ ہر صورت تلاش کی جاتی ہے۔ مایوس مریض تو شاید چند روز کے لیے سانس لینے میں کامیاب ہو جائیں لیکن مریضِ عشق کے لیے شفا ڈھونڈنا سراسر احمقانہ فعل ہے۔ موت کا بھی کبھی علاج ملا ہے ؟



جس محبت کے مقام پر میں بیٹھا تھا وہاں میں نے وحدتِ آدم کے گیت گائے تھے لیکن نہ تو کسی برگ کو جنبش ہوئی اور نہ سیار کی حقیقت نے میری رگِ احساس کو سہلایا۔ چاروں طرف خار ہی خار اُگ رہے تھے اور گلاب کا ایک بھی پودا پیشِ نگاہ نہ تھا۔



قیس کو محمل کی تلاش رہی۔ اس کی تلاش صحرا کی وسعتوں میں جاری رہی تاکہ اس کی محبت کسی منزل پر پہنچ پائے۔ تمہارا کام ذرا الگ ہے اور وہ صرف یہ ہے کہ صحرا کے ہر ذرّے کو نخلستان میں تبدیل کر دو تاکہ تھکا ماندہ قیس اگر کہیں بھٹک کر گر پڑے تو اُسے اُٹھنے میں آسانی ہو۔ اس کی تلاش جاری رہے اور محبّت کو شکست نہ ہو پائے۔



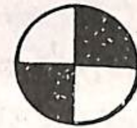
تمہارا کسی کو اپنی دید سے محروم رکھنا گناہِ کبیرہ سے کم نہ ہوگا۔ کسی کو محرومِ دید مت رکھو، کیوں کہ جو ہوش مند آپ کی طرف دیکھے گا وہ لازماً دیوانہ و حیران کہلانے کا مستحق ہوگا۔



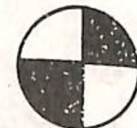
ایک نور کا پہاڑ اُمنڈا اور اس نے میری بساطِ دنیا پلٹ کر رکھ دی۔ اس پر یہ کہا جاتا ہے کہ طوفان چہروں کی شناخت کرنے میں ناقابل ہے۔



عشق الہام کا دوسرا نام ہے جہاں ہر اختیار بے قابو ہو جاتا ہے۔ حسن کی صحبت کی طلب اسے چلمن کے سامنے کھڑا رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ ورنہ کچھ عرصے کے بعد عشق تن آسانی کا بھی شکار ہو جائے گا۔ چلمن میں ذرا سی حرکت ہوتے ہی عشق پناہ مانگنے لگتا ہے۔ سہل پسندی کو دشواری میں تبدیل کرنا اسی کی فطرت ہے۔



حُسن عریاں ہو کر سامنے آ چکا ہے۔ عشق کے پاس ماسوائے زندہ رہ رہ کر مرنے کے اور کوئی چارہ نہیں۔ شیوۂ فریفتگی کی مصلحت اسی میں ہے کہ وہ اس طرح سے کسی کو بیمار کرے کہ اس کے لیے مرنا دشوار ہو جائے اور قضا شب خون کے لیے تیار رہو۔



ان کی اور میری نگاہ میں یہ دنیا الگ الگ نظر آتی ہے۔ ان کی نگاہ میں صرف میں ہی ایک

ہوں جس کی موت پر شاید ایک آدھ آنسو بہایا جاسکتا ہو اور میری نگاہ میں اس کی بارگاہ ہے جس میں میرے اور اُن جیسے لاکھوں کسی قلندر کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔



اے میرے محبوب اگر تم نے اپنے رُخ سے نقاب اُلٹ بھی دیا تو بھی میرا اس سے کچھ بگڑنے کا نہیں اور نہ ہی میں دیوانہ وار اس پر فریفتہ ہونے والا ہوں۔ آپ نے مجھے ہمیشہ ایک مشتِ غبار سمجھا اور مجھ پر اتنے احسان کیے کہ زندگی سے جی بھر گیا۔ ایک بار چہرہ دکھانے سے میرا اور کیا بگڑ سکتا ہے۔؟

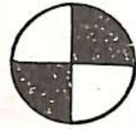


عشق کی کرامات میں جنون کو بہت دخل ہے کبھی سنگ در دست کبھی آوارگی سنگ و خشت سے کھیل میں مصروف ہے۔ دنیا و ما فیہا سے عشق لاپرواہ ہوا تو سب میخانے اُجڑ جاتے ہیں اور خانقاہوں پر نیند کا غلبہ چھا جاتا ہے۔



دل کا مکین دل سے نکل کر کہیں جا نہیں سکتا۔ وہ کبھی خلوت میں رہنا پسند کرتا ہے اور کبھی جلوت میں غائب ہو جاتا ہے۔ یہ غریب اپنے اندیشوں کا اسیر ہو کر پھر واپس دل میں آجاتا ہے۔ اس مکینِ دل کا یہی کمال ہے اور یہی اس کے زوال کا باعث ہے

کہ اسے نہ تو سوز اپنی طرف راغب کرتا ہے اور نہ ساز اس کی ادا میں رخنہ اندازی کرتا ہے۔



جب ہم نے ان کی جبیں کو کسی طرح چُوم لیا تب جا کر رُخسار کا لمس نصیب ہوا۔ عشق کے پیچ و خم میں یہ آخری داؤ تھا جو کسی طرح سے ہمارے حق میں پڑا۔ یہ سب کچھ ان کی نگاہ کا طلسم تھا جس سے ہم گھائل ہوئے لیکن اتنے نہیں کہ جامِ شہادت پی جاتے۔ ہمیں نیم جان سمجھ کر تلوار کا وار بھی ہم پر کیا گیا اگر تلوار کا یہ وار نگاہ کے وار سے پہلے ہو جاتا تو انھیں دوبارہ انتقام لینے کی زحمت نہ اُٹھانی پڑتی۔



میں تنہائی میں ڈوبا ہوا لق و دق صحراؤں میں چکّر کاٹ رہا تھا کہ اچانک ایک گمشدہ دوست کی آواز نے مجھے شدّت سے پکارا۔ آوارگی کی لذّت میں ایک چُبھن پیدا ہوگئی اور ایک دیرینہ خواب اُبھر کر سامنے آگیا۔ ظلمت کدوں میں مسکراہٹ پھیل گئی اور بجھے ہوئے دیے ٹمٹمانے لگے۔ اور تو اور صحراؤں کے ذرّوں میں چنگاریاں سی سُلگنے لگیں۔



میرا آپ سے ہی تعلّق تھا کہ میری آنکھوں نے سرکشی اختیار کی اور جلد ہی ہمیں اس

سرکشی کی کم ظرفی کا پتہ چل گیا۔ عین وہی وقت تھا جب میں نے پہلی بار آپ سے محبت کی بھیک مانگی تھی۔ میری آنکھوں نے مجھے گُدگُدا کر ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا۔



مجھے اصرار کرنے کی عادت نہیں کہ محبت کی بھیک مانگوں لیکن جب عشق حسن کا تعاقب کرتے کرتے تھک گیا تب اُسے اصرار اس لیے کرنا پڑا کہ اس کے خیال میں وہ امتحان کی تمام منزلیں سر کر چکا تھا لیکن عشق کے امتحانوں کی تعداد کا اندازہ اس کی عقل سے باہر تھا۔



ان کے ساتھ میری بات چیت کا سلسلہ جب منقطع ہوا تو یہ برسوں تک ایسا ہی رہا۔ اسی منقطع رشتے کو میں نے باہمی تعلقات کا ایک راستہ سمجھا۔ میں نے اس تعلق کو قایم رکھنے کی بھرپور کوشش کی لیکن جب ان کے سر سے پانی گذر گیا تب انھوں نے دوبارہ بات چیت کا سلسلہ شروع کیا



رہگذر اکیلی تھی۔ اس تنہائی میں تقدیر و تدبیر دونوں اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے کہ اچانک تیرے بدن کی خوشبو اس رہگذر پر پھیل گئی۔ گل و ساغر کے چند دیوانے کہیں سے لپک کر اس راستے پر آ گئے لیکن جلد ہی انھوں نے دَم توڑ دیا۔



شام و سحر مجنوں لیلیٰ کی تلاش میں رہا کہ اچانک لیلیٰ اس کے پاس سے گزری۔ مجنوں دَم بہ خود ہو کر ہاتھوں کی لکیریں دیکھتا رہ گیا۔ اس حقیقت سے چونک کر اس نے گردن اٹھائی تو دشت میں صرف آوازِ جرس گونج رہی تھی جس کا تعاقب بھی کوئی مجنوں بھی نہیں کر سکتا۔



دوستی کی وسعتوں میں سے جب تپش آنے لگتی ہے اور مجرمانہ نظریں ایک دوسرے کو گھورنا شروع کرتی ہیں تو آہستہ آہستہ وفا کے قبا چاک ہونے شروع ہوتے ہیں اور بے وفائی اپنے پاؤں زندگی کے خیمے کے اندر داخل کرنا شروع کرتی ہے۔



میں ایک شخص سے بخوبی واقف ہوں۔ وہ اکثر میرا راستہ کتراکر نکل جاتا ہے۔ اس کے چہرے پر کبھی مسکراہٹ دکھائی نہیں دی۔ ایسا شخص یقیناً غم گین ہوگا اور اُداس بھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا ایک دوست ہے جس کی دوستی اُسے راس نہیں آئی لیکن وہ اس کا پیچھا بھی نہیں چھوڑتا۔ اگر کبھی وہ مسکرانا بھی چاہے تو یہ دوست اُسے مسکرانے بھی نہیں دیتا۔ اس کا نام ہے افلاس۔



محبت کا دم تو بھرا جاتا ہے لیکن یہ ایک ایسے دشت کا سفر ہے جسے جھیلتے ایک عمر گذر جاتی ہے۔ ہر قدم پر فغاں اپنی تاثیر دکھاتی ہے اور کہیں کہیں خاموشی اسے آغوشِ قضا میں ڈال دیتی ہے۔ محبت رندوں کی پناہ گاہ اور پرہیزگاروں کا بُت خانہ۔ محبت کا نام لے کر پرہیزگار آوارہ راہوں پر چلتے تو ہیں لیکن اسے صلواتیں سُناتے راہوں سے بھٹک جاتے ہیں۔



ایک تم ہو کہ لفظِ محبت سے ناواقف ہو کیوں کہ اس سے واقفیت کا مطلب ہے درد کا سفینہ کھینا لیکن ہماری طرف دیکھو کہ ہمیں ستانے کے کتنے طریقے نکالے جاتے ہیں۔ خلد سے نکال کر روزِ محشر تک لے جانا سب درد کے درس ہی تو دینا ہے۔



یہ لازماً ابتدائے عشق ہوگی تبھی بتدریج آپ ہمارے نزدیک کھسکتے چلے آرہے ہیں۔ تمھارے دل میں ہماری چاہت بھی ہوگی۔ ہم تمھیں اچھے بھی لگتے ہوں گے اور اگر اس عشق کی انتہا ہوگئی تو اچھا لگنا تو درکنار آپ ہمیں دیوانہ سمجھ کر سنگسار کرنے پر بھی تیار

ہو جائیں گے۔



مدّت ہوئی زخمِ جگر میں ایک ٹیس سی اُٹھا کرتی تھی اور امید تھی کہ ان کی آمد سے یہ درد رفع ہو جائے گا۔ میرا محبوب آیا، میرے پاس بیٹھا اور چلا گیا تکلیف میں کوئی تغیّر نہ ہوا۔ یہ ویسے ہی بدستور قائم رہی جیسے شبِ ہجر میں ہوا کرتی تھی۔ ان کی اس نزدیکی اور آشنائی نے اتنا تنگ کیا کہ رنگ افسانہ وہیں کا وہیں رہا۔ ہجر اور آشنائی میں ایک سی ہی فضا رہی۔ اب کے صرف آنکھ سے لہو نہیں ٹپکا۔



یہ افسردگی کی بات نہیں اور نہ ہی مجھے ملول ہونے کی ضرورت ہے۔ وراثت میں جو ملا تھا وہ تو داؤ پر لگ چکا ہے حقیقت، چاک گریبانی، جبینوں کی ہمّت کیا کیا داؤ پر نہیں لگا۔ زندگی تاش کے پتّوں کی طرح بکھر گئی ہے۔ وراثت میں مجھے تنہا روی، دل کی دھڑکنیں، روتے ہوئے نغمے، درد بھری صدائیں ملی تھیں۔ یہ سب کیوں داؤ پر نہیں لگ سکیں؟



مصلحت کوشی کا دراصل مطلب یہ ہے کہ عشق سے جہاں تک ہو سکے دُور رہا جائے

لیکن دل کی وحشت نے عشق کو کچھ عجیب سبق پڑھایا کہ چاروں اطراف ان کی ستم گری نظر آنے لگی۔ عشق کے پنجے میرے تخیّل اور تصوّر میں کچھ اس طرح گڑ گئے کہ مجھے اپنی آغوش خالی سی نظر آنے لگی اور شادابیِ شب کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ عشق کی دُوری کو دُور کرنا تو درکنار، ہم خاطرِ دلِ بے تاب ہی کرتے رہے۔



میری آرزو کئی بار بیان کرنے کے بعد بھی پوری نہ ہوئی۔ چوں کہ دل کی پیاس نہ بجھی آنکھ سے آنسو بھی نہ ٹپکا۔ آناً فاناً کسی نے میرے دوش پر پہلے ہاتھ رکھا، پھر گیسو پھیلا دیے۔ اس چھیڑ چھاڑ میں تبسّم سے بھی کام لیا گیا اور ناز و ادا سے بھی۔ اس چھیڑ چھاڑ نے مجھے مطمئن تو کیا کرنا تھا البتہ رُلا ضرور گئی۔ ورنہ میں رونے کا قابل کہاں تھا۔



ہجر کی رات ہو یا جدائی کے اوقات سب کا انحصار سانسوں کے زیر و بم پر مبنی ہے۔ ہجر کی رات کتنی ہی رُوح کو اذیت پہنچانے والی کیوں نہ ہو۔ وہ سانس کے ساز پر ہی صَدا دیتی ہے۔ یہ ویسے ہی ہے جیسے ہجر کے بعد وصل کی رات کو تمام خواہشیں دَم توڑ دیتی ہیں لیکن سانس کا ساز بدستور بجتا رہتا ہے۔



کیا بہشتِ بریں ایک موہوم خیال ہے؟ ہوسکتا ہے لیکن یہ خیال دماغ سے اوجھل نہیں ہوسکتا اور اس میں وزن اس لیے ہے کہ جونہی حورانِ بہشتی کا ذکر کیا جاتا ہے تو میرا محبوب نہ صرف تلملا اُٹھتا ہے بلکہ لاجواب، سا ہوکر رہ جاتا ہے۔ کبھی کبھار اس کی آنکھوں میں حسد کے شعلے بھی بھڑک اُٹھتے ہیں۔



امید تھی کہ تمھاری دِید حاصل ہو اور یہ اُمید پُر اُمید بھی تھی۔ تاہم اس پر میرے محبوب نے ایک ہزار خفگیوں کا مظاہرہ کیا جس نے بے پروائی سے جوشِ وصل کی حدیث کو اپنایا، اس پر کیا عتاب نازل ہوا یہ میں ابھی تک نہیں جانتا۔



کبھی کبھار دل کی ویرانی کا وہ عالم ہو جاتا ہے کہ اس میں سے کسی کے قدم کی چاپ نہیں آتی، اور اگر کسی کے قدم کی چاپ نے ویرانیِ دل میں مخل ہونا چاہا تو سر اُٹھانے کی تاب نہیں ہوتی کہ دیکھا بھی جا سکے کہ وہ قدم کس کا ہے۔



اپنے محبوب سے فراق کا شکوہ تو ہے ہی جس نے زندگی اجیرن بنا رکھی ہے ساتھ ہی وصال کا مژدہ بھی ملا ہے جس سے زندگی

کا رُخ پلٹ گیا ہے۔ یہ دونوں محبت کی وہ صورتیں ہیں جب عشق کا خانہ خراب نظر آتا ہے اور اضطراب اضطراب میں کاکلِ پیچاں کی طرح پھنسا رہتا ہے۔



دنیا کے ذوقِ تماشا میں کمی آنے لگی تھی لیکن تمہارے حُسن کے فیضِ عام سے یہ کمی تو دُور گئی۔ لہٰذا اب اپنے جمال کی تپش کو تیز تر کر دے کیوں کہ لوگوں کے دلوں کی افسردگی کا کوئی حساب نہیں۔



ہم پر ایک ایسا عالم طاری ہے جس میں نہ کسی سے محبت ہے نہ کسی قسم کی شکایت ہے۔ ہر طرح کی رغبت بھی ندارد ہے۔ ایسے عالمِ وارفتگی کا ایک عجیب سلسلہ ہے جس کا نہ پاؤں ہے نہ سر۔



محبوب کی تمنّا اس لیے بھی روزافزوں زور پکڑتی ہے کہ کسی طرح اُسے دن بھر آنکھوں کے سامنے رکھ کر آنکھوں کی سیری کی جائے، لیکن یہ بھی عجیب ماجرا ہے کہ دن بھر اُس کے سامنے بیٹھے رہنے سے یا اُسے سامنے بٹھائے رکھنے سے بھی جسم و روح کی تشنگی نہیں مٹتی۔ کچھ اور

کرنے کو بھی دل بے تاب ہو جاتا ہے۔



کسی کی یاد پہروں رُلا سکتی ہے۔ کسی کی یاد کو بار بار گلے لگا یا بھی جائے تو بھی نتیجہ پہروں آنسو بہانے کا ہی ہوتا ہے۔ اس کڑی اذیت سے نجات مل سکتی ہے، بشرطیکہ موت کا تصوّر اس سے راحت دلائے لیکن اُسے بار بار بلانے پر وہ بھی عموماً ناکامیاب ہی رہتا ہے۔



عشق کرنا آسان سمجھا جاتا تھا اور اس کے لیے دل و جان قربان کر دیتے لیکن اب پر بھی بہت فریب کھانے پڑے۔ معلوم ہوا کہ شدّتِ عشق سے بھی کوئی منزل سر نہیں ہوتی۔



ضعف زندگی پر ایسا غلبہ ڈال دیتا ہے کہ محفلِ یاراں بکھر کر رہ جاتی ہے۔ یار و مددگار سب اُٹھ کر کہیں چل دیتے ہیں۔ ایسی حالت پر انکساری کے سوا کیا چارہ رہ جاتا ہے لیکن وائے زندگی کہ آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں گرتا۔



زندگی میں غم در غم سہنے کا مطلب ہے کہ ہم ایک پیکرِ الم بن کر رہ گئے ہیں۔ اسی غم کا مداوا ڈھونڈنے کے لیے دنیا کی کوئی دہلیز نہیں جس پر ہم نے اپنی جبیں خاک آلودہ نہ کی ہو لیکن غم ہیں کہ اپنی جگہ قایم ہیں۔



عشق بار بار نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ لوگ مجبور تھے جو ایک بار ٹھکرائے جانے کے بعد پھر عشق کا سبق نہ پڑھ سکے۔ طوفان ان لوگوں میں نہیں تھا۔ اُسے دوبارہ اپنا دل کسی کو دینے میں کبھی مشکل نہیں ہوئی۔ وہ کئی بار ٹھکرا دیا گیا تھا۔

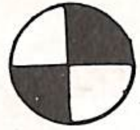


نہ جانے کیوں ہر شے اپنی مشکل کشائی پر مجبور ہے۔ محبوب کا تقاضا تھا کہ تمام لمحات ان کے لیے وقف ہوں۔ لہٰذا ان کی جلوہ گاہ کے لیے یہ وقف بھی ہو گئے لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ ان لمحوں کی بھی مشکل دُور نہ ہو سکی۔ شاید وہ ان کی جلوہ گاہ میں داخل بھی نہ ہو سکے۔



محبوب کی جانب نگاہ کا اُٹھنا لازم تھا، لیکن نگاہ اُٹھتے ہی نیچی ہو گئی کیوں کہ اُس

کی نظر میں وفا کا دخل نہ تھا اور ہر نظر میں وفا شامل نہیں ہوتی۔



اداؤں کی کمی نہیں لیکن ہر چہرے پر ہر ادا جچتی نہیں۔ ویسے ہی جیسے ہر شکل عشق کے قابل نہیں ہوتی۔



زندگی میں ایک موقع ایسا آیا کہ ہم نے ڈوبنے کی قسم کھا کر اپنی کشتی کو دریا کے حوالے کر دیا۔ عجب اتفاق رہا کہ ہم گردابوں سے اُبھر اُبھر کر نکلے اور دِل کا وہ درد جس کی وجہ سے یہ سب کچھ کرنا پڑا بدستور اپنی جگہ پر قایم رہا۔



محبت کا انجام سوائے دل کے اور کون پہچان سکتا ہے۔ ایک دل کی جتنی بھی قدر کی جائے یا بہ اندازۂ دیگر اس کی کتنی بھی قیمت ڈالی جائے اس کا شناسائی ماسوائے دل کے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔



مجھے اپنی چاہت کا انجام بہ خوبی معلوم ہے، کیوں کہ اگر میں ایک آہ تو کیا رات بھر بھی کراہتا رہوں تب بھی کوئی بدنام نہیں ہوگا۔



مستیِ موجِ دل آئی اور آکر سر سے نکل گئی۔ کیا کرتی۔ ایک ہی لہر میں تمھارا عہد و پیمان ڈوب گیا اور مستیِ دل ختم ہوگئی۔

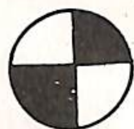


میرے آئینۂ دل میں آپ اپنی تصویر رکھ دیں کیوں کہ یہی تو آپ کا گھر ہے، یہی آپ کا آستان ہے۔ اس کے علاوہ سب چار دیواریاں ہیں اور اینٹ سیمنٹ کے ڈھیر ہیں۔



یہ کہانی کہ اُس نے فلاں کو اور فلاں نے اُس کو رسوا کیا، بے معنی ہے۔ جب کسی کو زندگی میں قرار ویسے ہی میسر نہیں تو اس میں کسی کو رسوا کر کے بے قرار کرنا اور بے معنی

ہو جاتا ہے۔



سچ بتاؤ کیا تمھیں اپنے حسن پر اعتبار ہے اور سچ پوچھو تو ہمیں اپنے عشق پر اختیار نہیں۔



آج میرے رقیبوں کے ہجوم میں میرا ہی ذکرِ خیر ہو رہا ہے، تاہم میرا ذکر تنہا ہے اور میرے رقیب لاتعداد۔ لیکن جس وقت سرِ مژگاں ایک آنسو آکر ٹھہر گیا رقیبوں کی انجمن میں میری اکثریت ہوگئی۔ میں اپنے رقیبوں پر اپنے غم کی بدولت حاوی ہوگیا۔



دل پر جب کوئی کاری زخم لگتا ہے تو کوئی دوا میسّر نہیں ہوتی اور نہ ہی لب پر کوئی دعا اثر کرتی ہے۔ اس وقت انھیں اپنی اہلیت جاننا مشکل ہو جاتی ہے کہ آیا یہ موت کا دور ہے یا دورِ زندگی۔



ایک ہوش رُبا نے میری وفا کا یہ صلہ دیا کہ بھری محفل میں وہ میرے نزدیک آکر

بیٹھ گیا اور میری اذیت میں اضافہ کرنے لگا۔



میری حیثیت جو تھی وہ تھی ہی لیکن جب سے غمِ جاناں کے درد نے تڑپانا شروع کیا ہے میری حیثیت میں (بطور عاشق کے) اور اضافہ ہو گیا ہے۔ غمگینیِ دل میں اضافے کے لیے میں ایک وصیت کر رہا ہوں اسے کان کھول کر سُننا "شکوۂ بیداد لاحاصل ہے کیوں کہ اپنے جنوں کا زعم رکھنا ضروری ہے۔ اپنی تنہائی ہی کو اپنی انجمن گردانو اور اسے میری بیش قیمت وصیت قبول کرو۔"



طوفان کا مسلک محبت ہے اور وہ بھی کل زمانے سے جس میں دوئی کی گنجائش نہ ہو۔ ایک ہی محبوب سے عشق کرنا اور وہ بھی عیاری سے، زندگی کے کسی پہلو کو درخشاں نہیں کرتا۔



ذرا عشق کا یہ منظر ملاحظہ فرمائیے۔ محبوب سامنے بیٹھا ہے لیکن عاشق کے سامنے رُخ پھیر کر جس کے دل میں سخت اذیت کن بے قراری پیدا ہو رہی ہے۔ وہ اپنے محبوب کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہے، ایسی حالت میں سخت جانی درکار ہے۔



عشق کے تمام راستے خطرات سے پُر ہیں۔ کوئی راہ ایسی نہیں جس میں خطرات کا لشکر پیغامِ اجل نہ دیتا ہو۔ اس راستے پر بھٹکنا، منتظر رہنا اور چاک گریباں ہونا تو معمولی سے واقعات ہیں۔



میرے محبوب کے لیے کسی پر اعتبار کرنا معمولی کام نہیں اس لیے اُس نے کسی پر اعتبار کرنے کی رسم ہی نہیں سیکھی۔ زمانے بھر میں اُس نے ہمیں بے اعتبار کہہ کر رُسوا کر دیا ہے۔ عشق کا ایک کھیل یہ بھی ہے۔



عاشقی کا مطلب ہے زندہ رہ کر عشق کرنا اور ایسا عشق سبھی نبھاتے ہیں۔ لیکن اگر لازوال محبت کرنے کی اُمنگ ہے اور اس سے کچھ امید بندھی ہے تو اس کے لیے موت کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔ عشق کی امیدواری کے لیے موت لازم ہے۔



میرے دل میں ہزاروں سوال تھے اور ان گنت وُسوَسے۔ دنیا کے ہنگاموں کا جواب

نہ تھا اور چاک گریبانوں کا شمار نہ تھا۔ اچانک تم سامنے آگئے اور تمھاری دُزدیدہ نگاہیں اُٹھیں اور تمام سوال اور وسوسے کہیں اٹک کر رہ گئے۔ دزدیدہ نگاہوں نے ماحول کا جائزہ لیا تو اقبال مندوں کا اقبال کسی شے کا طلب گار نہ رہا اور کبیروں کی کبریت رُوندی ہوئی ہچکیوں کی طرح نظر آنے لگی۔



حسن اپنی تمام تر جلوہ گاہوں میں تبھی نظر آتا ہے جب اس کی رُسوائی انتہا تک پہنچ جائے۔ میری ہوس نے تمہاری تصویر کو سامنے رکھتے ہوئے تمھیں رُسوا کرنے کی انتہائی کوشش کی لیکن اس کا اثر نہیں ہوا۔ نہ معلوم کیوں ؟ شاید خالی جذبۂ ہوس سے محبت کی رُسوائی نہیں ہوتی۔



جس کے دل میں محبّت کرنے کی تمنّا نے ہی دَم توڑ دیا ہو اس سے عشق کرنا تو ایسے ہی ہے جیسے چاروں طرف موسمِ خزاں ہو اور بہار کی انتظار نہ ہو اور نہ ہی کوئی اس کی چرچا کرنے پر راضی ہو۔

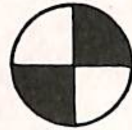
یہ تمنائے محبّت اداؤں کے ایک سلیقے کا نام ہے۔ اگر وہ سلیقہ ہی غائب ہے تو ادا کا کیا مطلب۔ چہرے کے نکھار سے محبّت کی ادائیں نہیں اُبھرا کرتیں۔ دیکھو ایک ذرّے کا رقص تمھارے چہرے کے نکھار پر حاوی ہے۔ اس میں اُڑنے کی ایک جستجو تو ہے۔



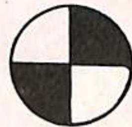
محبوب کے دیدار سے دل میں کوئی کسک اُٹھے تو اس کی آستان پر سر رکھنے میں لُطف بھی آئے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو جبین کو خاک آلود کرنے کا فائدہ کیا؟



تم نے اپنا دامن ہمارے ہاتھوں سے چھڑا لیا اور سمجھا کہ آپ نے مجھ سے خلاصی پانے میں کمال دکھایا ہے۔ لیکن تمھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم نے اپنے دل میں ایک ایسی شے چھپا رکھی تھی جس کا آپ کو علم ہی نہ تھا۔ وہ میرا دل تھا جو لگاتار آپ کا تعاقب کرتا رہا۔



مجھے سوال کرنے کی عادت تھی اور آپ سے میرے ہر سوال کا جواب اس کے کرنے سے قبل ہی مل جاتا تھا۔ اب سوال کا جواب مانگتا ہوں تو آپ فرماتے ہیں کہ آپ نے ایک خط ارسال کر رکھا ہے۔



دن تو اُداس تھا ہی لیکن آج رات بھی غمگین ہے۔ بہت کوشش کی کہ اس دلِ داغدار کو اپنا لیں لیکن یہ اپنا نہ ہو سکا۔



ان کا سامنا ہونا تھا سو ہوا لیکن یہ سانحہ نہایت جگر خراش واقع ہوا۔ سوزِ غم کو اپنے دل میں دبانے کی کوشش کی گئی لیکن معاملہ بے سُود ہی رہا۔

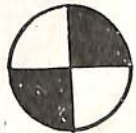


میرے محبوب نے کہا کہ اگر کوئی کرامات کر کے دکھاؤ تو سمجھیں کہ تم ہم سے محبت کرتے ہو۔ ہم نے ویرانی کی دہائی دی اور اپنا گھر جلا کر خاکستر کر ڈالا۔



یہ ہمارا شہر بڑا عجیب شہر ہے۔ اس میں طرزِ دید الگ ہی ہے۔ ایسی حالت میں اس شہر کے قاتلوں سے کوئی نگاہ ملانے کے لیے تیار نہیں۔

میرے محبوب تو رقیب کا ہو لیا اور میرا وجود برائے نام رہ گیا ہے، لیکن میری خاموشی ایسی ہیبت ناک ثابت ہوئی کہ میری آنکھ سے بھی دو موتی گر پڑے۔



محبوب کے ناز اُٹھانے آسان کام نہیں۔ قلب و جگر اس گرمیِ دوراں میں محفوظ

نہ رہ سکے ۔ یہ گرمیِ دوراں زندگی کی روزانہ کی کاوش کا نام نہیں بلکہ محبوب کے بے جا ناز اُٹھانے کا نام ہے اور اسی لیے اُس کے ناز اُٹھاتے کون مِٹ نہیں گیا۔



تیرگی کے پَردے آسانی سے نہیں اُٹھتے لیکن جب جز و کل نے باہمی کشمکش سے گریز کیا اور ایک دوسرے میں سَما گئے تو کفر و ایمان نے بھی ایک نئی بنائے تہذیب ڈالنے کے لیے ایک دوسرے کو گلے مل جانے کی صدا دی۔



دنیا میں وقت آیا جب کہ نہ تو عشق باقی رہا اور نہ کوئی حسن کا معجزہ ہوا۔ دنیا حسن و عشق سے بے نیاز ہو گئی اور وہی سب کے لیے فنا کی صورت بنی۔ کون و مکان مٹ گئے۔ لے دے کے خدا کی رضا باقی بچی۔ ایسا سنتے ہیں۔



شبنم کا فریب ایک عجیب و غریب فریب ہے جو عاشقوں کو اپنے دام میں اُلجھا لیتا ہے لیکن ہماری حالت میں یہ بھی کارگر نہیں ہو سکا۔ ساقی کا عکس پڑتے ہی دنیا کی نگاہیں محوِ تماشا ہو جاتی ہیں لیکن ہماری نگاہ نے اس تماشے کو بھی ٹھکرا دیا اور اپنی بے رُخی کی حالت میں مست رہی۔



مجھے اپنے شباب پر ناز تھا لیکن ساقی نے مجھے اپنے اسی عہدِ شباب میں رُسوا کیا اور وہ بھی بھری محفل میں۔ مجھ سے یوں مخاطب ہوا "کیا آدابِ محفل سے ناواقف ہو" یہ کہہ کر مجھے محفل سے اُٹھا دیا گیا۔



حُسن کو ناز رہا کہ اس نے بہت احسان کیے ہیں لیکن حسن سے پوچھنا چاہیے کہ پہلے وہ اپنے جھُٹلائے ہوئے عہد و پیمان کا حساب دیکھے اور اس کے بعد اپنے احسانات شمار کرے۔



حُسن و عشق کا یوں تو نہاں ہونا مشکل ہے لیکن زیرِ داماں دونوں کہیں نہ کہیں پوشیدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک نقاب ہوتی ہے جس کے پیچھے حسن و عشق دونوں بے ننگ و نام ہو کر سامنے آتے ہیں۔



حسُن نے آج تک عشق کو ناصح کی شکل میں دیکھنے کی کوشش نہیں کی اور

وہ بھی جب حُسن پیکرِ حُسن بن کر سامنے آیا۔



بے خودی کے عالم میں یہ طرفہ ماجرا بھی دیکھنے میں آیا کہ نہ کوئی ساکن ہے اور نہ کوئی حرکت میں۔ شعلہ و شمع دونوں ایک ساتھ ساکن بھی تھے اور ان کا رقص بھی جاری تھا۔ ایسی صورت میں شبِ ہجراں کی کسی کیفیت کے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شبِ وصال شبِ ہجراں کا ہی حصّہ ہو جاتی ہے۔



عشق میں بدگمانی پیدا ہو جاتی ہے لیکن جب اپنے عشق سے ساتوں طبق روشن ہو جائیں تو نہ صرف بدگمانی ہی آخری دَم لیتی ہے بلکہ اسے زلفِ پریشاں سے بھی کوئی مطلب باقی نہیں رہتا۔ عشق بدگمانی کے بغیر اپنی معراج پر ہوتا ہے۔



میں شہر یاری تک جانے سے رہا۔ ملاقات کب سے ختم ہو چکی ہے اور راہ و رسم و جان پہچان نغمہ بہ لب بن کر ٹوٹ چکی ہے۔ پھر بھی وہ میرے نزدیک آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھیں ضرور مجھ سے کچھ نہ کچھ پرانی عداوت ہے کہ وہ میرے دل کے داغ گننا چاہتے ہیں۔

عجب ماجرا ہے کہ مجھ سے زیادہ انھیں میری تمنّا ہے۔ ایسا کبھی ہوتا تو نہیں ۔



میری شکایت کیا ہوسکتی ہے ! آپ چلے گئے تو گرمیِ محفل بھی ختم ہوگئی۔ ننھے کچھ دیر تک فضا میں بکھرتے رہے اور تمھاری یاد خوشبو بن کر اِدھر اُدھر گلیوں میں گھومتی رہی، جیسے میں نے چھونے کی ناکام کوشش کی تو ایک اچھا خاصا ہنگامہ میری قسمت بن گیا۔ میری شکایت کیا ہوسکتی ہے ۔ !



عشق کا نتیجہ رُسوائی نہیں بلکہ یہ کھیل رُسوائی کو سہلانے کا ہے کہ وہ آئے اور آہستہ آہستہ آئے اور برداشت ہوتی جائے ۔ کچھ اس میں کڑواہٹ ہو کچھ مٹھاس اور زیادہ درد و کرب ہو۔ اس راز کو کوئی کھولتا نہیں بلکہ یہ خود بہ خود کھل جاتا ہے، محرمِ راز حیران و ششدر رہ جاتا ہے کہ یہ راز دنیا پر کیسے عیاں ہوگیا۔ محرم راز کوئی بھی کیوں نہ ہو یہ رازِ عشق راز نہیں رہ سکتا۔



محبت کو کسی قسم کی شرکت قبول نہیں لیکن نشو و ارتقا نے اس کی بھی اجازت اس بے حیائی سے دی کہ آدم سوال کرنے پر مجبور ہوگیا ہے کہ اُسے حوّا کے حوالے کیوں کیا گیا تھا۔



کبھی کبھی لوگ عشق کی فطرت کو جاننے کی کوشش میں سرگرداں گھومتے رہتے ہیں۔
دراصل یہ ایک انداز ہے اور احساس میں ایک ہیجان پیدا کرنے والا زلزلہ ہے۔ عشق کا
تعلق نہ تو آنکھوں میں بھری شراب سے ہے اور نہ ہی تمھاری رہگذر سے ہے۔ یہ بیچارے
دونوں تو ایک مغموم تصوّر کا عکس ہیں۔



آب گینے جو کہ مے سے پُر ہیں۔ اُن کی تشنگی بھی ناپید ہے۔ ہٹ چکی ہے،
لیکن ہماری حالت ملاحظہ کیجیے۔ ہم صرف ایک جام کے تمنائی ہوئے تھے تو اسے
بجھانے کے لیے بھاگی ہوئی پیاس آئی اور اس نے ہمارے لب چوم لیے۔



راہزن کی لوٹ کا تذکرہ یونہی ہر ایک کی زبان پر آجاتا ہے۔ دراصل یہاں تو لوٹنا
شرمندۂ رہزن نہیں۔ یہاں تو ویسے ہی سب کچھ لُٹ رہا ہے۔ صبح ہوئی اور چاند ستارے
لُٹ گئے اور رات کے ہوتے ہی کوئی خال خال شباب ہی اس لوٹ سے بچتا ہوگا۔

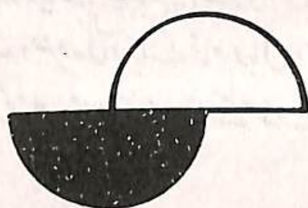


دنیا والوں پر یہ راز عیاں ہونا چاہیے کہ بے جا خودی بدگمانی بھی ہے اور کم نگاہی بھی۔ جب زندگی نے روتے روتے بسر ہونا ہے تب اپنی اپنی امّت کو خودی کے خواب دکھانا کسی نادیدہ خوف پر معمولی سی فتح پانے کا دوسرا نام ہے۔ جانبازی خوف و حراس کو دُور کرتی ہے اور خودی کی رٹ ایک مسلسل کم ظرفی کا نمونہ ہے۔



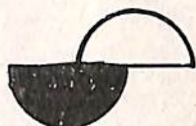
کسی طرف نظر اُٹھائیے جہل پرورش پاتا نظر آتا ہے۔ کہنے کو لوگ خودی کی تلاش میں ہیں۔ خدا کی تلاش میں ہیں۔ سیم و زر کی تلاش میں ہیں، ایسی حالت میں نارِ خودی یا کسی ضیا کی تلاش بے معنی رہتی ہے۔



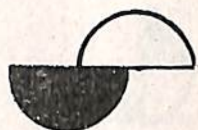


کفر و ایمان

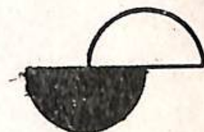
دار و رسن



تاریخ کا یہ ایک باب خونچکانی کی حکایت ہے۔ جب فقیروں نے کج کلاہی کی اور جن کا شمار کج کلاہوں میں تھا: وہ اس تلاش میں رہے کہ بہتی زمین پر ایک مسند ہی بچھی ہوئی مل جائے۔



اعتباری و بے اعتباری ایک دوسرے کو بیگانہ وار دیکھتی ہیں۔ میں نے تمہارا اعتبار کیا تو اپنا اعتبار کھو بیٹھا اور دنیا نے مجھے بے اعتباری انسان گردان لیا۔ اس دنیاوی بے وفائی نے ہماری اتنی مدد ضرور کی دنیا کے تمام وبال جو میری ہر رعنائیِ خیال کے دشمن تھے، خود یہ خود مجھ سے چھن گئے اور میں اپنی سوچ کے عشرت کدوں میں پھر سے گم ہو گیا۔



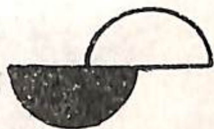
دنیا منتِ فہم رہی ہے اور یہ سب لیل و نہار فہم کے ہر شعبے سے بالاتر رہے سر تو اس کا قلم ہونا ہی تھا جو اپنے کو شہریار سمجھتا تھا اور منتِ فہم کو درگزر کر کے لطفِ محفل لینے لگا تھا۔



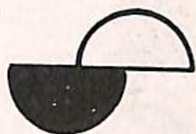
آدمی یوں تو کئی باتوں پر ہنستا ہے، مسکراتا ہے لیکن جب وہ عشق و محبّت میں فریب کھاتا ہے اور وہ بھی کسی کے تبسّم کے فریب میں پھنس کر تو اس حالت میں لگتا ہے جیسے سب گناہ گناہوں کے غبار سے تجاوز کر گئے ہوں۔



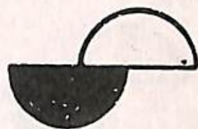
اس دنیا میں ایک سے ایک دعوے دارانِ پرہیزگاری تشریف لائے جن کے صوفیانہ خیالات کو مات دینا ایک نہایت مشکل امر تھا لیکن کیا یہ سب درویش طوفان جیسے پرہیزگار اور صوفی منش سے بھی بڑھ کر تھے؟



یہ میرا قصور تھا کہ میں نے ان کی آمد کی خواہش کی اور وہ آئے اور ان کی آمد پر جو نقشۂ حیات پلٹا وہ قابلِ معافی نہیں تھا اسی لیے قصوروار ہونے سے قبل ہی ہمارے ہاتھ کانوں تک پہنچ گئے اور معافی کے خواستگار ہوئے۔ ان کا دیدار ایک ناقابلِ معافی جُرم بن کر رہ گیا۔



طوفان کو دوزخ راس آئے گا نہ جنت راس آئے گی' اور ویسے بھی ان دونوں میں سے اُسے کچھ منظور نہیں۔ اس کے لیے سزا و جزا کی تلاش ایک احمقانہ فعل ہے۔ کیوں کہ وہ ذوقِ نظر کا متلاشی ہے اور اُسے اہلِ نظر کی صحبت منظور ہے۔ ایسے لوگ جنت میں ملتے ہیں نہ دوزخ میں۔



جب بدنامی اس گھر کا ایک حصّہ بن جائے اور زمانہ اپنی فرعونیت کی بدولت بدنام ہو جائے تو گناہ خاموشی کے پردوں میں سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ ضرورت اس نظر کی رہتی ہے کہ جس سے کچھ صدا پیدا ہو تا کہ خاموشی کا پردہ فاش ہو لیکن خاموش گناہوں سے کسی صدا ـــــ کی امید کرنا بے معنی رہتا ہے۔



آستانِ یار پر لگاتار سجدہ ہو رہا ہے اور جبیں ہے کہ در سے اُٹھنے کا نام نہیں لیتی لیکن طوفان کو خدا کی عبادت ایک آسان سا کام نظر آتا ہے اگر اس نے بھی درِ یار پر سجدہ کیا ہوتا تو اُسے معلوم ہو جاتا کہ عبادت کسے کہتے ہیں۔



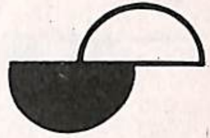
زندگی میں راہبانہ لباس کو ترک کیا اور ایک غلطی کا مرتکب ہوا۔ میں نے ذوقِ طلب کو مدِنظر رکھتے ہوئے کسی کے تبسّم پر جان فدا کرنے کی ٹھان لی۔ پرواز کرتے کرتے میں فلک سے گر پڑا اور میری وفا کی ایسی توہین ہوگئی جس کا کوئی جواب نہیں۔



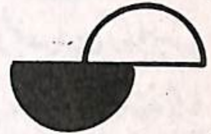
انسان نے برسوں پہلے درسِ بندگی مختلف اداروں و شخصیات و مذاہب سے لیا۔ لیکن کسی بشر نے اپنے کو نہ پہچانا لیکن جونہی انھوں نے اپنی شکل آئینے میں دیکھی تو ان سب کو اپنے چہرے عصیاں آلودہ نظر آئے۔



خلد سے آدم کا نکالا جانا فطرت کا ایک غضب تھا۔ جنّت کے تماشائیوں نے جن میں فرشتے و حوریں شامل تھیں اس پر قبضہ کر لیا۔ جنّت کا کیا بگڑا۔ انسان کی گردشِ لہو میں کمی ہوگئی لیکن حوریں ، حورانِ بہشتی کہلانے لگیں اور فرشتوں کی فتوحات میں ایک اور اضافہ ہوگیا۔



میں گھر سے زندگی کی تلاش میں نکل رہا ہوں اور اس کے کچھ اسباب بھی ہیں۔ جاتے جاتے ایک پتے کی بات کہ جاتا ہوں اور وہ یہ کہ آج کل انصاف کا پلڑا ایک طرف زیادہ جھکا ہوا ہے۔ اسے سیدھا کرنے کے لیے سَر دھڑ کی بازی لگا دینا۔ یہ کام میں نہیں کر سکا، لہٰذا میں زندگی کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ انصاف کا پلڑا جب سیدھا ہو جائے تو مجھے آواز دینا۔ میں جب زندگی کے راز کو پا لوں گا تب میں واپس لوٹ آؤں گا۔



جب زمانے کی ہَوا گرد آلود ہو جاتی ہے تمام مسرّتیں مَوت کی نذر ہو جاتی ہیں۔ یہ گرد کوئی معمولی گرد نہیں ہوتی بلکہ عیّاری کا نقاب اوڑھے ہوتی ہے اور عیّاری بھی وہ جو درویشی کو سرِ بازار فروخت کر دے۔ اُڑتی گرد کو دیکھ کر مسرت پہلے تو کانپتی ہے اور بعد میں غم میں تبدیل ہو کر فنا ہو جاتی ہے۔



سِکّوں کا جیب میں بجنا بھی آج کل عشق کا پیغام دیتا ہے اور کھنکھناتی ہوئی جیبیں زلیست کے لیے راہیں کھول دیتی ہیں۔ اس کے باوجود ان سیمیں آوازوں کے بھیڑ بھڑکّے

میں ایک قلاش کیسے گھِرا ہوا ہے جس کی ساری عمر ان آوازوں کے قہقہوں کو سنتے گذر گئی ہے اور جس نے یہ جبینیں کبھی اپنے غصّے کے خنجر سے تہیں تراشیں۔



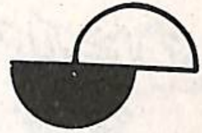
کچھ اہلِ احساس خاک کے ذرّے کو چشمِ حسیناں پر ترجیح دیتے ہیں اور زندگی کی کسی قدر پر مَر مٹتے ہیں۔ کچھ میرے جیسے سخت جان ہیں کہ معروفِ پرستش بھی ہوں تو کوئے جاناں کے خیال سے ہر سانس میں اپنے کو ہی لبھانا شروع کر دیتے ہیں۔



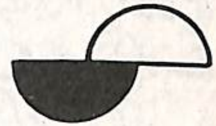
لوگ انتظار کی راہوں سے ایسے وابستہ ہو چکے ہیں کہ وہ تمام عمر ان راہوں پر نہ صرف چلتے رہتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ سادہ خواہشات کے جہنّم میں پیہم جلتے بھی رہتے ہیں۔



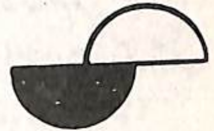
ان کاروانوں کا کیا حال پوچھتے ہو جو اس دنیا میں بھٹک گئے اور جن کا آغاز کسی نہ کسی درد کے رنگ سے ہوا تھا۔ ایسا درد جس کے سائے تلے ہی ہر جان پہنچی، مہتاب اُبھرے اور خورشید ڈوبے۔



ابرِ رحمت کی توقع تھی۔ وہ برسا اور اس پر ہمیں بہت ندامت ہوئی۔ کیوں کہ ہم نے طے کیا تھا کہ بے گناہ رہیں گے لیکن گناہ کے عمل میں آتے ہی ابرِ رحمت اُمنڈ پڑا اور ہمیں شرمسار ہونا پڑا۔



اَیّامِ جوانی میں جب تمنّا جوان ہوتی ہے تب کیا کیا نہیں ہوتا۔ نفع و نقصان کی کون سوچتا ہے۔ لے دے کے ان پر جان قربان کرنے کی ہی مسلسل تمنّا رہتی ہے اور یہی تمنّا بڑھاپے کی طرف لے جاتی ہے۔



اگر ہم تصوّف کے حامی نہیں ہیں تو ہمیں کسی قسم کی سیاہ کاری سے بھی پرہیز نہیں ہے۔ ہماری زندگی کا شغل رِیاکاری ہے اور اسے ثابت کرنے کے لیے ہمارے ہاں ایک صنم کا بھی قیام ہے۔



رحمتِ حق نے میرے عارض پیار سے چھوئے اور یوں گویا ہوئی کہ خدا کی

عظیم کتاب میں طاعت و عصیاں میں ایک شمّہ بھر فرق نہیں۔



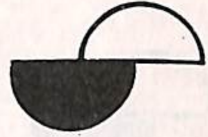
میں نے اپنی زندگی میں تمام سوال غلط طور سے پیش کیے، یا جو سوال میرے دماغ میں اُٹھے وہ غلط تھے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وقتِ محشر مجھے میرے کیے گئے سوالوں کے جواب بھی غلط مل رہے ہیں۔



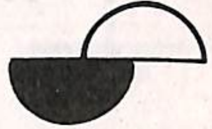
جنّت کی سب حوریں میرے وقار سے خایف ہیں۔ جب میں جنّت میں موجود نہیں ہوتا تو ان کا اضطراب قابلِ دید ہوتا ہے۔



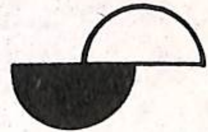
کوئی شک نہیں کہ محفل کا شباب ہمارے دَم سے تھا اور ہمارے دَم سے محفل جوش میں تھی۔ ہمارا وہاں سے چلا آنا تھا کہ ان کو اپنی شرکت کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا۔



آوازِ حق کس سے ملتی ہے؟ یہ آوازِ باطل سے الگ نہیں۔ یہ کہنے کو ویسے ہی ہے جیسے دین ہو یا دنیا، دونوں کے سازِ شکستہ ہی نظر آتے ہیں۔ دین والے اتنی ہی گمرہی کا شکار ہیں جتنے دنیا والے۔



زندگی میں گناہ و ثواب کا حساب نہیں دیا جاتا، اس کا حساب موت کے بعد ہوتا ہے۔ یعنی دنیا کے مسائل موت کے بعد بھی ہمراہ جاتے ہیں۔ گناہ و ثواب کا حساب کب تک چلتا ہے، کوئی نہیں جانتا لیکن دن ورات اس کا حساب ہوتا رہتا ہے۔ اگر یہ حساب دنیا میں کردہ گناہوں اور ثوابوں کا نتیجہ ہے تو بعد از مرگ بھی انسان کو غمِ دنیا سے نجات نہیں ملتی۔



یہ جنت ہے، وہ خدا ہے، یہ آدم ہے اور وہ کوچۂ جاناں ہے۔ یوں تو سب الگ الگ حقیقتوں کے مالک نظر آتے ہیں لیکن دراصل ان سب میں کوئی نہ کوئی سمجھوتہ

ضرور ہے۔ اسی لیے یہ ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔



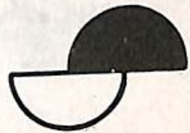
میرے سینے میں کسی نے حسد کا خنجر اُتار دیا اور میرے شور کے تھپیڑوں سے عالم کا سکوت پریشان ہو گیا۔ میری نظریں ایک دُور افتادہ مزار پر اک کرن کی صورت میں اُتریں تو کسی گورِ غریباں کا ذکر میرے ہی لبوں پر آ گیا۔



وہ ننگ دھڑنگ تھا۔ اس کا چہرہ کسی کتابِ یاس کا ایک ورق تھا۔ کسی کو اس کی طرف نگاہ اُٹھانے کی فرصت ہی نہ تھی۔ کیوں کہ سب معقول طور پر خاک شناس نہ تھے اور جس کسی نے اس برہنہ شخصیت کو دیکھا اسے وہ بےلباس ہی نظر آیا۔

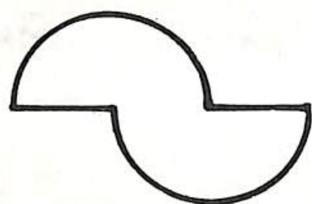


فطرت کے تقاضے ہیں کہ ساتوں افلاک پیہم حرکت میں رہیں اور ایسی صورت میں کسی ایک شخص کے مقدّر کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ افلاک کی گردش لگاتار اسے اور انسان کو تسکین بخشتی جائے۔ فطرت اتنی فراخ دل نہیں وہ اتنی بخیل بھی نہیں کہ کبھی کبھی ہمیں چین کا ایک لمحہ بھی نہ دے۔



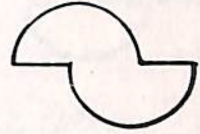
وہ برسوں سے شہر کا مقیم تھا۔ اچانک اسے اپنے گاؤں واپس جانے کی سوجھی۔ جب وہ دہقانی حدود میں داخل ہوا، اس کا پیرہن پھٹا ہوا تھا لیکن اسے اپنی اور اپنے شہر میں قیام کی داغ داغ عظمت کا پاس تھا۔ وہ دوزخ کی خاک کو خیرباد کہہ کر آیا تھا۔ لیکن اسے اُس کی مٹی کی ساحری سے نجات نہ تھی۔ وہ ایک سجا ہوا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔



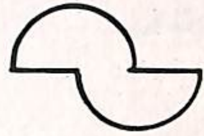


دَشتْ و دَمنْ

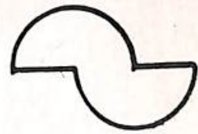
خَسْ و خار



خزاں خزاں ہے اور ناحق میں بدنام ہے۔ کیا دنیا میں کوئی ایسا شجر ہے جو
کبھی بے بہار کے رہا ہو۔

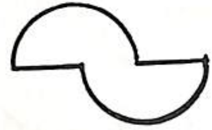


زمانے میں پھول تو کھلتے ہی ہیں لیکن خار بھی مانندِ مژگانِ خوباں ہر دامن سے
اُلجھنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ان کو یوں زندہ رہنے کا پیغام کون دیتا ہے؟ کوئی گردش
ایسی ہے ضرور جو زندگی کے اتنے ارزاں ہونے پر بھی زندہ رہنے کی امید بندھاتی ہے۔ اس گردش
کا کیا نام ہے جس کا سراغ نہیں ملتا۔

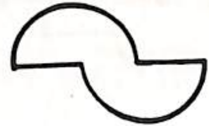


دنیا کی کوئی انجمن ہو، محفلِ یاراں ہو، بزمِ محبوب ہو من و تو کا فاصلہ کبھی نہیں مٹتا۔
آرزو، خواب و خواہش اس فاصلے کے حصے ہیں اور یہی اس دنیا میں تاریکی کا باعث ہیں
یا تیرگی اسی کا دوسرا نام ہے۔ حسرت من و تو کا اہم حصہ ہے اور طویل رات بھی اسی
کی ایک شکل ہے۔ زیست کا تمام افسانہ تاریکی کے گہوارے سے نکلتا ہے اور اسی میں

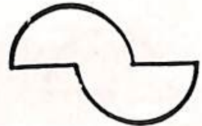
غایب ہو جاتا ہے۔



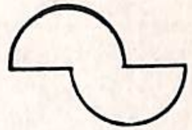
نورجس کے دل میں کدورت کا شمّہ بھر بھی نہیں ہوتا اور جو کندن بھی ہے اور چاندی بھی، وہ ایسا نظر آتا ہے جیسے بے یار و مددگار بھٹک رہا ہو اور پیہم دہک رہا ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ چراغ بجھنے کے قبل سسکیاں کیوں بھرتا ہے؟



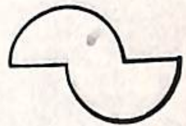
میں اپنے چمن کو خوب پہچانتا ہوں۔ کئی بار تو خار میرے ساتھ اُلجھ کر مجھے اپنے گلے لگا لیتے ہیں لیکن کچھ عرصے سے یہ چمن بلائے جان ہو کر رہ گیا ہے۔ خار تو خار پھول بھی میری قبا کو چھونا پسند نہیں کرتے۔



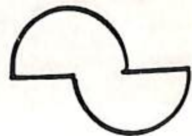
عقل کے پردے اگر عقل کے سر سے ہٹ جائیں تو نت نئے معجزے ہوتے ہیں۔ ان میں سے طلسماتی معجزہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی خود بڑھ کر اپنے ہاتھوں سے اپنا آشیاں بجلیوں کی زد میں رکھ دیتا ہے۔



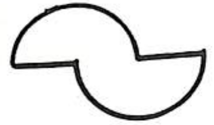
تمھارے استقبال کے لیے چاروں طرف پھول کھلتے ہیں۔ تم نے جدھر سے گذرنا ہوتا ہے اُدھر کیاریوں کی قطاریں لگ جاتی ہیں۔ یہ جو تمھارے استقبال کے لیے پھول کھل اُٹھے ہیں انھیں چھوتے ہوئے ان کے درمیان سے گزرو تو سہی۔ ان کا جلوہ اور حسن چند روزہ ہے۔ ان کے دل کے درد کا بھی کچھ علم نہیں لہٰذا انھیں ناامید مت کرو اور انھیں چھوتے ہوئے ان کے درمیان سے گذرو تو۔



جو مجھ پر گزر رہی ہے اُسے مجھ کو ضبط کرنا پڑ رہا ہے لیکن ضبط کا یہ شعور اپنے ضبط سے باہر ایسے ہوتا جا رہا ہے جیسے کوئی خزاں بہار سے باہر نہیں ہوتی لیکن خزاں خزاں ہی رہتی ہے اور بہار بہار۔



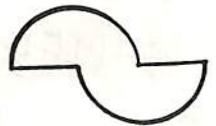
رات پڑ چکی ہے، تاریکی بڑھ رہی ہے، تنہائی کا عالم ہے۔ یہ رات کیسے کٹے گی۔ اُمید ہے کہ یہی رات کوئی پیغام لائے گی جس سے پُرانی یادیں تازہ ہو جائیں گی، یہ یادیں خاموشی سے اُن بہاروں کو دیکھتی رہیں گی جنھیں کبھی عالمِ شباب میں کسی کے ساتھ دیکھا کرتے تھے۔



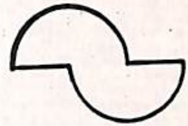
کہا نہیں جا سکتا کہ جب پا بجولاں ہونے کی سزا ملتی ہے تو پاؤں آگے بڑھ کر بیڑیاں ڈلوا لیتے ہیں یا بیڑیاں آگے بڑھ کر پاؤں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں. بہ ہر صورت یہ اسیری کا عالم ہوتا ہے جن کا ہمیں کبھی رنج نہیں ہوا۔



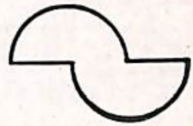
اچانک قفس کو لے کر کوئی اُڑ گیا۔ قوّتِ بازو سے سوئے فلک گیا اور خودی و بے خودی کے نگہبانوں کا مُنہ چڑاتا رہا۔ یہ قوّتِ پرواز محکومی سے نجات حاصل کرنے کے لیے تھی اور شرحیات و ممات کی دُنیا سے آگے جانے کا خواب تھا۔ جو کچھ بھی ہوا اس وقت ہوا جب ہمّتِ پرواز جواب دے چکی تھی۔



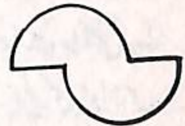
گدائی کا نعرۂ انقلاب اپنا رنگ دیر میں لاتا ہے لیکن جب نامہ بر کے ساتھ ساتھ آپ بھی تشریف لے آئیں تو لازماً دامنِ صبر ہاتھ سے چھُوٹ جائے گا۔ میری دُنیا کی لن ترانیوں کو بلبلوں کی نوائیں بدلتے دیر نہ لگے گی۔ دراصل اسی کا نام تو انقلاب ہے۔



نظر تو نشتر کا کام کرتی ہی ہے لیکن اب یہ نظریوں اُٹھنی چاہیے کہ ہماری رگِ جاں پر نشتر کا کام کرتی دکھائی دے ۔



مسکراؤ تاکہ مسکراہٹوں کی صحبت میں گلستان صحیح معنوں میں گلستان کہلانے کا حقدار ہو جائے اور آدمی کی شر آمیز حرکتیں کچھ کم ہوں اور وہ انسان کہلانے کا مستحق ہو ۔



عجب انقلاب ہے کہ میری کسی سے خط و کتابت نہ ہونے پر بھی مجھے خط موصول ہوتے ہیں جن میں مجھے کئی القاب سے مخاطب کیا جاتا ہے ۔ مجھے میرا پتا بتایا جاتا ہے حالاں کہ میں نہ تو کسی کو جانتا ہوں اور نہ مجھے اپنے آپ کا پتا ہے ۔

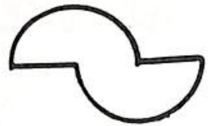


جب تک میں اکیلا تھا زمانے کی آنکھ مجھ پر تھی اب اتنے جمِ غفیر میں گھر چکا ہوں کہ

نہ تو کوئی میری بے داغ جوانی پر ترس کھاتا ہے اور نہ کوئی میرا غم شناس بننا چاہتا ہے۔



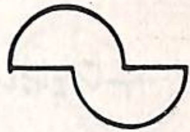
بہار و خزاں میں کتنی دوری ہے۔ کتنا فاصلہ ہے میرے جنوں کا ایک قدم بہار میں ہے تو دوسرا خزاں میں۔ حیات کے اتنے مختصر ہوتے ہوئے بھی نہ تو دشت و صحرا کی غضب ناکی دور ہوئی ہے اور نہ بہار کی خوش گواری۔



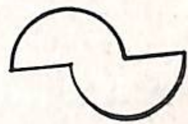
عالم کے ہنگاموں میں کسی کو کسی کا پاس نہیں۔ نہ ساحل کو دریا کا اور نہ دریا کو کشتی کا۔ صحرا قیس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا اور قیس محمل سے بے خبر ہے۔ جانتے سب ایک دوسرے کو ہیں لیکن واقفیت کے گرداب میں کوئی کسی کا روشناس نہیں۔



دستِ غیب جب ہجر کی رات کی تشکیل کرتا ہے تو وصل کے لمحات اور نزدیک آجاتے ہیں۔ اس تماشے کا اثر کسی ایک زندگی کے ہر شعبے پر تو پڑتا ہی ہے مگر گل و بلبل پر جو اس وقت گذرتی ہوگی، اس کا ذکر میں کیسے کر سکتا ہوں۔



صیّاد کا کام ہے نشیمن کو اُجاڑنا۔ قدرت کے ایک سحر کو، جسے پرندوں کا نشیمن کہا جاتا ہے۔ اس کا یا تو تنکا تنکا الگ کیا جاتا ہے یا کبھی کبھار اس پر بجلی گرتی ہے۔ صیّاد کا ہر انداز مجرمانہ ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ پہلے ترتیب وار شجر پر وار کرتا ہے اور پھر سارے گلستاں کو پھونک دیتا ہے۔ قدرت کا عتاب صیّاد کی شکل بن کر نشیمن پر نازل ہوتا ہے یہی قدرت کی ستم ظریفی ہے اس میں شاعری کی گنجائش نہیں۔

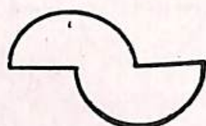


تخت و تاج کا حاصل کرنا بھی مصیبت ہے اور لاؤ لشکر سے چھٹکارا پانا بھی مصیبت ہے۔ ان ہر دو مصیبتوں سے وہ لوگ کبھی نہیں گھبراتے جو ستاروں پر اپنا نشیمن بنانا چاہتے ہیں، کیونکہ اگر امید کسی کے لیے دعا کرتی ہے تو وہ ایسے ہی لوگوں کے لیے کرتی ہے جن کا تجسس کسی شے کو حاصل کرنے یا اُسے چھوڑنے میں ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔

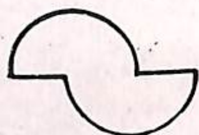


میں ایک شخص کو پہچانتا ہوں کیوں کہ وہ میرے راستے کے پاس ایک سیڑھی پر بیٹھا ہوتا ہے اور اس کے چہرے پر فٹ پاتھ پر لگے قمقموں کی روشنی رات بھر برابر پڑتی رہتی ہے اور لوگ بھی اس کے پاس سے گذر جاتے ہیں اور سب کا

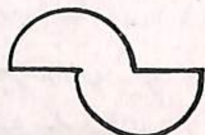
یقین ہے کہ جس مکان کے تلے وہ بیٹھا نظر آتا ہے وہ اُسی کا ہے، حالاں کہ فٹ پاتھ بھی اس کا نہیں۔



دنیا میں زر کے چشمے اُبلتے ہیں اور زر خاک کے ہر ذرّے پر حاوی ہے چاہتے ہو تو سر پہ کفن باندھ کے اسے چھین لو یا بے وجہ اسے گنوادو۔ خس و خاشاک اکٹھے کرتے اتنی ہی دیر لگتی ہے جتنی مداری کو ہجوم اکٹھا کرتے اور اسے بکھرتے ہوئے بھی اتنا ہی وقت چاہیے جتنا کسی شیشے کے ساغر کو زمین پر گرتے ہوئے۔



پھولوں کی کرامات یہی ہوتی ہے کہ وہ جانتے بوجھتے ایک مسکراہٹ کے ساتھ شاخوں سے جُدا ہوجاتے ہیں۔ وہ سیدھے زمین پر گرتے ضرور ہیں اور کسی کے پاؤں تلے مسلے جاتے یا بنا توجہ مُرجھا جاتے۔ ایسے وقتوں میں ان کی سب سے زیادہ مددگار ہوا ثابت ہوتی ہے جو انھیں ہر آنچ سے بچاکر دُور لے جاتی اور ان کی مددگار ثابت ہوتی ہے۔

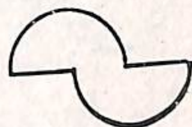


پرواز کی ہمت تھی لیکن اب جب یہ نظر آتا ہے کہ قفس اور صیّاد دونوں میں مجھے تہہِ دام لانے کے لیے راز و نیاز کی باتیں چل رہی ہیں تو ہمّتِ پرواز بھی نہیں پڑتی۔ قفس

کو تو ہم اُڑا کر لے جایا کرتے تھے اور صیّاد کے دام سے بھی فرار ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن جب صیّاد و قفس دونوں آپس میں ہمارے پر و بازو کاٹنے کی سرگوشیاں کریں تو پرواز بھی عاجز آجاتی ہے۔



مختصر و محدود زندگی میں ہر بشر کی یہی کوشش رہی کہ وہ جاگتا رہے اور اس کی آنکھوں کے دِیوں میں روشنی رقصاں رہے لیکن نیند کا ایک جھونکا کسی جنّت سے اُٹھا اور آنکھوں کے دِیوں کو بُجھاتا چلا گیا۔

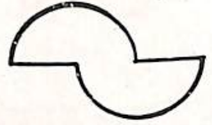


غمِ جاناں کا ذکر گُل کھِلے گلشنوں میں بھی اکثر آجاتا ہے اور زندگی کے دُھندلکوں میں تو اس کا داغوں کی طرح روشن رہنا لازمی ہے۔ غمِ جاناں ماضی کی لغزشوں کی بدولت سفید دامن کو ہاتھ پھیلانے پر مجبور کر دیتا ہے اور ماضی کی یہ لغزشیں دردِ دل کو یوں پیٹتی ہیں جیسے خزاں کی شوخی بہار کے شباب پر شب خون مار رہی ہو۔

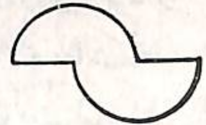


مجھے شہر سے نکالنے کے مشورے اس لیے ہو رہے ہیں کہ میں ہُنرمند نہیں۔ یہ تیرہ دل دانشور کبھی میری صحبت میں نہیں رہے اور نہ انھیں میری تلخیاں جھیلنے کی ہمّت کا پتہ ہے میں دانشوروں کے دامِ فریب کبھی نہیں پھنسا، صرف ان کے عتاب کا نشانہ بنا رہتا ہوں۔ انھیں شہر میں صرف وہ لوگ

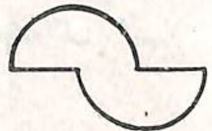
پسند ہیں جو میرے جیسے غیر ہنر مند لوگوں کی محنت پر پلتے ہیں۔



اِن کھِلے گلوں کے چہرے تو اس امید سے شگفتہ ہو رہے ہیں کہ وہ کھلنے والے ہیں اور اس کے ساتھ ہی خاروں میں بھی ایک نئی تڑپ جنم لے رہی ہے۔ کچھ پاؤں تیزی سے ان کی طرف بھی بڑھ رہے ہیں اور دونوں امیدِ فردا کے فسوں میں گرفتار ہیں۔ میرے لیے امیدِ فردا کے لیے کوئی سجدۂ شوق پیدا نہیں ہوا۔ میرے حال کے سامنے کوئی نقشِ قدم نہیں اور میرے ماضی نے پائے ساقی پر سر رکھ کر دیکھ لیا کہ سب مجھے روندتے ہوئے نکل گئے۔ خاروں کو اپنا آب و تاب اور پھولوں کو شباب مبارک۔ میرے عہدِ فردا میں اب کوئی شباب کی جھلک نہیں۔



اکثر تند ہواؤں کے خلاف انسان کی فطرت زور آزمائی کرنے پر آمادہ ہوتی رہتی ہے اور جب کبھی کوئی ایسا واقعہ منظرِ عام پر آتا ہے حقیقتوں کے نام بدل جاتے ہیں۔ کوئی فتح کو رنگِ گلستان کہہ کر پکار دیتا ہے اور کوئی شکست کو غمِ ہجراں کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

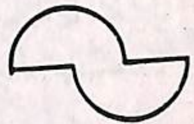


عموماً دعوتِ پرواز اونچا اُٹھنے کے لیے اُکساتی ہے۔ جب کبھی یہ خواہش پیدا ہو تو

یقیناً صیّاد کا خوف دماغ سے نکل جاتا ہے۔ اسی طرح اگر میرا محبوب میرا ہمراز بن جائے تو میں اگر قفس میں بھی ہوں تو بھی اس کے قفل کھل جائیں گے۔



بُوئے گُل موسم بہار میں آئی تو اپنے ساتھ میرے محبوب کی خوشبو بھی لیتی آئی اور اس کی لپیٹ کے نخانوں کو چھوتے ہی زندگی رقص کرنے لگی۔



جب کوئی جستجو نہ ہو تب اسیری کا رنج ہوتا ہے۔ لیکن جب رنگ و بُو کی جستجو جاری ہو تو اسیری کا خوف حوصلہ شکنی کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ ہم جب موسم بہار کے تصوّر پر اپنا دل و دماغ لٹائے بیٹھے تھے تب بادِ سموم نے آناً فاناً ہمیں لُوٹ لیا۔



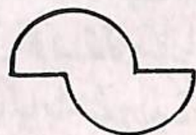
زندگی کے ہر گلشن میں پھولوں کی رگوں پر تیز نشتر رکھ دیے جاتے ہیں اور اگر کوئی احتجاج کرتا ہوا سامنے آتا ہے تو اس کی زبان کاٹ لی جاتی ہے۔ اس پر تعجب اس بات کا ہے کہ کوئی زبان کھولنا پسند نہیں کرتا۔



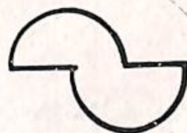
صیاد نے یہ خیال کرنا شروع کیا کہ چمن میں چہچہاتی ہوئی بلبلیں کسی طرح پکڑی جائیں۔ اس خیال کی حصولی کے لیے اُس نے قفس کی تیلیوں پر پھولوں کا سایہ ڈال دیا۔



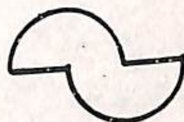
کیا انھیں معلوم نہیں کہ میں کتنا اُداس ہوں اور میرے دل پر کیا گزرتی ہے۔ میرے عشق کی آگ پر مایوسیوں کے بادلوں کے چھینٹے پڑ چکے ہیں۔ وہ الگ بات ہے کہ میں تصویرِ یار کو اپنی نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے دیتا لیکن مایوسی کا ابر و باد تو خاموش نہیں رہنے والا۔ اسی منظر میں رنگ بھرنے کے لیے تم نے ایک اور وعدہ آنے کا کیا ہے اور میں اب کسی دُھواں دُھواں سے وعدوں میں پھنسنے کا نہیں۔ جھوٹ مت بولو، تمھیں معلوم ہے جو میرے دل پر گزرتی ہے۔



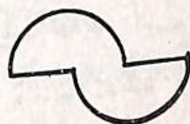
جب نصیب سویا ہوا ہو تو وہ کسی تلاش میں سرگرداں ہونے کے باوجود بھی خفتہ بخت ہی رہتا ہے۔ ایسے ہی صاحب اگر کوئی پرند اسیر ہو کر قفس کے اندر پرواز کی کوشش کرے تو وہ کہیں نہیں پہنچ سکتا۔



خاک اُڑنے لگتی ہے تو خاروں تک کے نہ صرف کلیجے پھٹ جاتے ہیں بلکہ ان کی نگاہوں کا نور چھین جاتا ہے۔ یہی خار تھے جو بڑے طمطراق سے جیتے تھے اور جنہیں زندگی میں ہر خزاں سے انتہائی محبت تھی۔



انسان نے کئی غلط سبق پڑھے اور وہ کئی غلط راہوں پر چلا۔ کبھی ویسے ہی اور کبھی دیدہ و دانستہ۔ لیکن کسی شہر میں ایک اجنبی کی طرح اُسے یہ غلط راستہ کون بتاتا ہے کہ اس آج کی دنیا میں تسکینِ دل ممکن ہے اور آرزوؤں کا فریب ناپید ہے۔

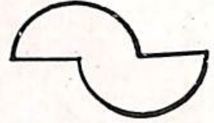


مجھے ہر گام پر صبر کی تلقین کی جاتی ہے۔ چاہے پاؤں کے آبلوں میں کتنے ہی خار کیوں نہ چبھے ہوئے ہوں کسی بھی پاؤں کی حفاظت ہوئی ہوتی نظر آئے تو صبر کا پیالہ اداس نغموں کے سائے تلے اطمینان سے پیا جا سکتا ہے۔ پر کیا کیا جائے ہر ایک گل اپنے ہی باغباں سے خوف زدہ نظر آتا ہے۔

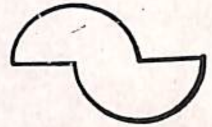


فصلِ گُل کے بعد عمر کی خزاں کا آغاز ہوتا ہے اور اس آغاز کے منبع سے پھر

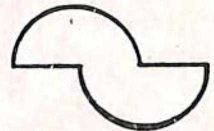
کون کون سے خواب اور زخم اُبھرتے ہیں ان کی کچھ خبر نہیں ہو سکتی۔ اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خواب اور مندمل نہ ہونے والے زخم، کن حسرتوں اور مایوسیوں اور خوشیوں کو جنم دیں گے۔



مَیں نے بہ مشکل چند تنکوں کا ایک آشیاں کھڑا کیا تھا جسے ایک صبح، بادِ نسیم لے اُڑی۔ اب ہر تنکے کی اپنی ایک داستان ہے جس میں تمھاری ہی زندگی کا ذکرِ خیر ہے۔

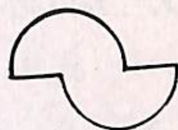


کھلے چمن کو دیکھ کر لوگ کہہ دیں گے "واہ! چاروں طرف پھول کھلے ہیں"۔ لیکن یہ پھول ایسے ہی نہیں کھِل جاتے۔ گلستان میں کانٹوں کا پھولوں کے ساتھ رہنا لازم و ملزوم باتیں ہیں۔ لہٰذا کسی گُل کو اگر چمن میں کِھلنا ہے تو اُسے بھی کانٹوں کی دوستی کے لیے جان کی بازی لگانی پڑے گی۔



میرا کوئی زخم شرمندۂ مرہم نہیں ہوا اور کسی کی غم خواری میں وہ انجانے وقتوں تک رِستے رہے۔ خزاں کا دَور آیا، پھر بہار نے اُس کی جگہ لے لی۔ اچانک زخموں نے

چند پرندوں کو جام چھلکاتے دیکھا تو وہ خود بہ خود ہی مندمل ہو گئے۔



آج پھول صبح سے سرگوشیاں کر رہے تھے کہ دیوار کی آڑ میں سے کوئی آواز نہیں آئی۔ لیکن جب کانٹوں نے میرا دامن تھام لیا تو میرے کانوں میں پھولوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ ایک دوسرے کو کہہ رہے تھے کہ ہو سکتا ہے کہ گل چیں کل صبح گل گشت کرنے کے لیے آئے لیکن آج رات کو آسمان سے پریاں اُتریں گی۔





دیر و حرم

عذاب و ثواب

نہ جانے کس کی سوگواری میں نوحہ خوانی ایک ایسے انداز میں ہوئی کہ ہر آنسو مچل مچل کر نکلا اور ہر آواز ریزہ ریزہ ہو کر ٹوٹی۔ یہ شاید اُن گلوں کا ماتم تھا جو موسمِ بہار میں طوفان نے بَرپا کیا تھا۔

وہ نہ تو دیر و حرم گئے اور نہ ہی میخانے۔ ایسا کام کوئی دیوانہ ہی کر سکتا ہے وہ بے شک دیوانے ہوں گے لیکن لگتے فرزانے ہیں۔ اُن سے یہ توقع!

میرے درد نے اُس روز شورش دکھائی جب ساقی کے اصرار پر ایک جام پینا پڑا۔ اس کے چڑھتے خمار سے زندگی میں پہلی بار فکر و عمل سے نجات ملی اور اپنی بے خودی نے زمین کے چپے چپے پر اپنی بے ثباتی کی مہر لگا دی۔

تبدیلی دنیا کا دوسرا نام ہے۔ جب انسان کے خود ساختہ دیر و حرم میں تبدیلی

آنے لگی تو اس کے ساتھ ہی ناقوس و اذان میں بھی تبدیلی آگئی۔ واعظ کا ذرا سا بدلنا تھا کہ اس کے ساتھ ہی برہمن بھی بدلنے پر مجبور ہو گیا۔

جب بھی دیکھتا ہوں تمھیں دُور سے ہی دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔ کسی بہانے سے میرے قریب آؤ۔ اور کچھ نہیں تو ایک پیالہ جام دینے کے بہانے سے ہی ایسا کرو میرا خالی پیالہ میرے لیے اکسیر کا کام کرے گا۔ یہ خالی ہو گا تو اُسے بھرنے کے لیے آپ نزدیک آئیں گے اور آپ کے نزدیک آنے سے میں زندہ کھڑا ہو جاؤں گا۔ خالی پیالہ اوروں کی تشنہ لبی کا گواہ بن سکتا ہے لیکن میرے لیے یہ ایک نئی زندگی لائے گا۔

کچھ لوگ بے خودی کے متلاشی ہیں اور کچھ ہوش کے خواہش مند۔ اصل میں دونوں میں ایک گہرا تعلق ہے۔ شمع تو بے خودی میں جلتی رہتی ہے اور پروانہ بہ تمام ہوش اپنے مجبور شوق کو پورا کرنے کے لیے فنا ہو کر بے خودی کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔

رنگِ شراب ارغوانی ہے اور جو چاہے اسے پی لے۔ لیکن یہ طرفہ ماجرا ہے کہ

ہر کوئی اس کی طرف ہاتھ بڑھانے سے جھجکتا ہے۔ کیوں؟

ہر محبوب کو ایک وہم ہے کہ اس کے بغیر اس کے چاہنے والوں کی تشنگی دور نہیں ہو سکتی۔ حالاں کہ اُسے یہ معلوم نہیں کہ مے خواری کے لیے دو چار میگساروں کا ملنا کوئی مشکل کام نہیں۔ وہ تو بند مے خانوں کے باہر ہی مل جاتے ہیں۔

خدا کی صورت یا اُس کے جمال کا ہر کوئی متلاشی ہے۔ اس نور کو حاصل کرنے کے لیے نمازی سجدے میں گرتے ہیں لیکن وہ اس سجدے میں کب تک پڑے رہیں گے۔ اگر انھیں دلفریبیِ جمالِ خدا درکار ہے تو وہ سر اٹھائیں اور بت خانے کا رُخ کریں۔

سیدھے راستے پر چلتے ہوئے بھی منزل کا ملنا لازمی نہیں کیوں کہ جیسے ہر رہ گزر کی منزل نہیں ہوتی۔ ویسے ہی جیسے ہر رندِ مے خوار کی محفل نہیں ہوتی۔

وہ بے مکان تھا، یکایک مکین ہو گیا۔ اُس کی نیکسن کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے لیکن جو محرومِ تمنّا ہو وہ نیکسن کو کہاں سے تلاش کرے۔

ایک صنم کی نگاہِ ناز جلوۂ حسن سے کم نہیں ہوتی۔ یہ طوفان کا پختہ خیال ہے اور اگر صنم کی اس نگاہِ ناز کا موازنہ کرنا ہو تو وہ مے کے ایک پیمانے سے ہو سکتا ہے جو خود نگاہِ ناز کا مالک ہوتا ہے۔

شراب کا ایک قطرہ نظر آئے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ رُوح کی پیاس کی آواز بن کر آیا ہے۔ یہ قطرۂ مے اُس ایک بوند کی طرح بھی نظر آتا ہے جو اِک راگ ہو اور جسے استادانِ فن اپنے ساز پر نہیں بجا سکتے۔

جب نمازی نماز ادا کرتے ہیں تو اس وقت اُن کے ساتھ مسجدوں کے منبر و مینار بھی سجدے میں آجاتے ہیں لیکن سب حُسن کے دیدار سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں حسن

کی اصلی بے حجابی تو بت خانے میں ہی نظر آتی ہے جہاں وہ مکمل طور سے بے نقاب ہوتا ہے اور اسی میں شانِ خدائی نظر آتی ہے۔

●

طوفان جیسا انسان جو کبھی جام و سبو کا شیدائی تھا اب مے خواری سے گھبرا گیا ہے۔ اس کی زندگی کا ہر ہنگامہ بھرے بازار کی ایک عام بات میں منتقل ہو کر رہ گیا ہے۔

●

موت سے ہر انسان خوفزدہ ہے لیکن شراب کے ہر قطرے سے خود موت خائف زدہ رہتی ہے اس لیے جوں ہی مے کی وسعت وسیع ہونے لگتی ہے خزاں کا آغاز شروع ہو جاتا ہے اور موت کا رقص جنگلوں و چمن زاروں میں شروع ہوتا ہے۔ ایسے وقتوں میں شراب کے آب پینے سے تو کیا اس کے جرعات سے ہی موت کے اعضا میں کپکپی شروع ہو جاتی ہے۔

●

مے کی لذت کا اندازہ رات اور دن کی طوالت سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے سرور کی لذت دن و رات دونوں کو گھیرے رکھتی ہے۔ یہی وہ وقت ہے جبکہ مے کی بدولت پیدا ہوئے کثرتِ نظارہ سے درویشی کا آغاز شروع ہوتا ہے۔

انسان ہنگامے پیدا کرتا رہتا ہے اور اپنی سیہ کاریوں کی بدولت ان میں اور اضافہ کرتا ہے لیکن ایسے پیدا شدہ ہنگاموں کی ایک حد مقرر ہے۔ ہاں وہ جرعۂ مے جن کا سیہ کاری میں شمار نہیں اُسی سے بلخ و شیراز کی عظمت بنتی ہے اور زوال پیدا ہوتا ہے۔ اسی کے کثرتِ استعمال سے قومیں وقت کی تہوں میں دفن بھی ہو جاتی ہیں۔

رندانِ میکدہ یعنی اس دنیا کے لوگ ایک عجیب تشویش کی حالت میں سرنگوں کیے بیٹھے ہیں۔ انھیں شراب چاہیے جو ختم ہو چکی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ کسی کو کسی کی خبر نہیں کہ وہ کس رنگ میں جی رہا ہے۔

دیر و حرم کا پاس اس حالت میں کئی گنا بڑھ جاتا ہے جب کہ اس کے نزدیک ہی کوئی میکدہ بھی ہو۔ شمعِ کفر کے روشن ہونے سے دین و ایمان کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

کہنہ بادہ کش اپنی حالت میں مست رہتے ہیں۔ انھیں کسی انسان کی غربت سے چنداں مطلب نہیں ہوتا ویسے ہی جیسے جو انسان دیدۂ شوق لیے گھومتے ہیں انھیں چشمِ حیراں سے کوئی مطلب نہیں رہتا۔

قدرت کا خوفناک عتاب دیکھنا مقصود ہو تو اپنا ڈھلتا ہوا شباب دیکھو۔ قدرت انسان سے اس سے بُرا انتقام اور کیا لے گی۔

اسی عتاب کا نتیجہ ہے کہ تمام پیمانے شکستہ ہو چکے ہیں اور مینا ایک دم خالی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ایسی حالت میں بچی کھچی شراب کیا رنگ لاتی ہے۔ چھلکتے ہوئے پیمانوں کے رنگ تو مدت ہوئی دیکھ چکے ہیں۔

ہمارا خرمنِ ہستی نذرِ آتش ہو گیا اور اثاثۂ زندگی خاک ہو کر رہ گیا لیکن اس کے باوجود بھی تمھاری یہ کوشش کہ تمھارے سامنے اپنی ہر بازی ہار جائیں کامیاب نہ ہو سکی۔ ہمارے جیسے میخواروں پر آپ کے حُسن کا سحر زیادہ کارگر نہیں ہو سکتا۔

عالمِ بے خودی سے بڑھ کر اور کوئی عالم نہیں۔ اس عالم میں جامۂ احرام تن سے اُتر گیا اور ہم عُریاں ہو گئے لیکن کسی بے خود کو عُریانی سے کیا مطلب، وہ خود عُریاں ہو، یا کوئی سیم تن عُریاں ہو۔

صنم خانوں کے بُت بقول کسی شاعر کے بہت پُرانے ہو گئے ہیں۔ یہ حقیقت تسلیم کی جا سکتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی ایک بے حاصل جستجو کی طرح سامنے کھڑا ہو جاتا ہے کہ یہ طویل عمر حرم میں بھی کب تک صرف ہو گی۔

خنجر کا ہاتھ اُٹھا تو چیختا ہوا کہ اس وار کو سنبھالو۔ یہ وار ابھی تک ایک سوال بن کر میرے سامنے کھڑا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ خنجر میرے لیے نہیں بلکہ میرے اُس احساس کو قتل کرنے کے لیے اُٹھا تھا جس نے اپنا عَلَم لہرانا شروع کیا تھا اور ایسا ہوتے ہی دنیا کو ایک راہبر نظر آنا شروع ہوا تھا جو صدیوں کے بعد کبھی کبھی نظر آتا ہے۔

یہ ممکن ہی نہیں کہ آسمان پر ستارے اس دنیا کی محفلوں کی رونقوں اور میخانوں و پیمانوں کو دیکھ کر رات بھر کروٹیں نہ لیتے رہیں۔ اُنھیں اتنی بے چینی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ قدرت کے پیرِ مغاں بھی ان کی سیری کر کے انھیں نیند پر آمادہ نہیں کر سکتے۔ تب بھی کوئی نہ کوئی انھیں درسِ صبر دیتا ضرور ہے کہ یہ کاروبار تمھیں راس آنے والا نہیں۔ یہ سبق انھیں کون پڑھاتا ہے؟ میں اس کی کھوج میں ایک دوزخ سے دوسرے دوزخ تک جاتا ہوں۔

مجھے صبحِ صادق کا انتظار ہے۔ ایک تاریک و لمبی رات کے بعد، اور اس کی پروا نہیں کہ آسمان سے سب ستارے غائب ہو جائیں گے۔ نہ مجھے اس کی فکر ہے کہ سب آب گینے چور چور ہو جائیں گے۔ مجھے تو زندگی کا وہ لمحہ درکار ہے جب مے کی کمی نہ ہو اور میگساروں کو اس کی محرومی کی شکایت نہ ہو۔

ساقی کا جانا تھا کہ میخانے سے میگساروں کی ہاؤ و ہو شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ کعبہ و بُت خانے سے بھی ایک عجب قسم کا وردِ قلندرانہ شروع ہو گیا اور کوئی کسی کی پاسبانی کرنے والا نہ رہا۔

آپ بھی پیتے ہیں اور میں بھی اور وہ بھی روزانہ پیتے ہیں۔ کمی نہ تو آپ کو محسوس ہوتی ہے اور نہ مجھے۔ البتہ پینے کے ارادوں میں فرق ضرور ہے۔ آپ پینے کے طرزِ عمل کو بالائے طاق رکھ کر پیتے ہیں اور میں اس طرز کی عملاً حاشیہ آرائی کرتا ہوں۔ آپ کو پینے سے زیادہ بہکنے میں لطف آتا ہے اور میں اس کی ہمہ گیری سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔

مے کی کمی نہیں اور بھرے پیمانے ساقی سے پوچھ رہے ہیں کہ وہ کس کی تشنگی کیسے دُور کریں۔ ساقی میں ہر وہ طاقت پوشیدہ ہے جو لبالب بھرے آب گینوں کو آنکھ جھپکنے میں خالی کر دیتی ہے۔ مے اور ساقی دونوں کا فرض ہے کہ وہ بیزار رندوں کو سرشار کر دیں۔ یا یہ بتائیں کہ رندوں کا فرض کیا ہے!

دیوانے کا کیا ہے اُس نے اپنے لباس و پیرہن و دامن کو چاک چاک کر ڈالا۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک ٹکڑا جو نہی تمھارے ہاتھ لگا تو وہ پاکیزہ کہلانے لگا۔

تیر کلیجے میں چبھے تو دل میں ایک خلش پیدا ہو سکتی ہے۔ یہاں معاملہ اُلٹ تھا۔ تیر کمان سے چھوٹا بھی نہ تھا کہ کلیجے میں ایک خلش سی پیدا ہونی شروع ہو گئی اور یہ سب اُس حالت میں ہوا جب میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا تھا۔ یہ بے خبری کا عالم اُس وقت طاری ہوا جب یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ اس بے خبری سے پہلے کیا عالم تھا۔

ساقی کی تشنہ لبی کا نتیجہ یہ نکلا کہ عروسِ زلیست پریشان ہو گئی۔ ہر عمارت کو ٹھونک بجا کر دیکھ لیا۔ سب جگہ میخانے برباد نظر آئے اور تمام پیمانے ٹوٹے ہوئے دکھائی دیے۔ یہ بھی ایک فطری تقاضا ہے کہ جام و سبو اعتراف کریں کہ وہ تشنگی دُور کرنے کے ذمّے دار نہیں صرف ذریعہ ہیں۔

آنکھوں کی جھلک سے کبھی پاکیزگی اُمڈتی ہے تو یہ ان کی نذرِ ہوس ہو جاتی ہے۔ جن کو اس کی عظمت کی حفاظت کے لیے مامور کیا جاتا ہے۔ دنیا کی متجسّس نگاہیں انھیں غیرت دِلانے کی بے سُود کوشش کرتی ہیں۔ ہوَس اپنا شکار ڈھونڈنے میں نہ صرف کبھی کوتاہی نہیں کرتا بلکہ پاکیزگی کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ بے وفائی کا دامن تھام لے۔

دیر و حرم میں سو بار جانا ہوا۔ وہاں کے شعور و اسرار اس بات کے محرم بنے رہے کہ کوئی راز افشا نہ ہو۔ گمرہی کا جو عالم تھا وہ قایم رہا۔ میں گھبرا کر میخانے کی مملکت میں داخل ہو گیا جہاں خود شناسی نے گمرہی کے پردے چاک کر دیے۔

شراب سے مجالس آرائی کا کام خوب خوش اسلوبی سے ہوتا ہے اور خیالوں و یادوں کی سرکشی و بے باکی اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ ہونے والا تھا کہ تنہائی نے مجھے شکست دے دی اور میں نے دیکھا کہ ساقی میرا ہم راز نہیں میرا جام خالی ہے اور تشنگی میرے چاروں طرف گھوم رہی ہے۔ پھر کسی نے مجھے دُنیا کے میخانے سے باہر نکال دیا۔

جب کتابِ زندگی وا ہوئی تو کسی ورق پر میرا کوئی راز چھپاں نہ تھا۔ نہ میری نگاہ کو خودی مقصود تھی اور نہ ہی میں بے خودی کی تاثیر سے کسی مستی میں مبتلا تھا۔ زندگی کے ساز سے نہ تو صدائے چنگیزی نکلتی تھی اور نہ ہی اس سے خود نمائی کی کوئی آواز سنائی

دیتی تھی۔

ہر زندگی کا بار اُٹھانے کے لیے ایک فریب کا سہارا چاہیے۔ زندگی کے لیے سب سے عظیم فریب میخانہ ہے اور میخانے کا ساقی ہے جو کسی صورت میں میرا ہمراز نہیں۔ میں نے اس فریب سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ساقی نے درپردہ میری ہر مہم کو شکست دی اور پیامِ زندگی کے فریب کو میرے نزد نہ آنے دیا۔

میں جس جگہ تمھاری تصویر سی بنا رہا تھا تم خود چل کر اسی جگہ پہنچ گئے۔ تمھاری ہمراہی میں تخلیہ تھا، چاندنی تھی اور تبسّم تھا۔ ایسی جلوت کا کیا کہنا کہ جب عشق کی عظمت تعمیر ہو جائے۔ ہاں اس وقت پیمانے میں صرف شراب نہ تھی۔

دنیا مانندِ صحرا ہے تو اس میں شدّت کی پیاس اُٹھتی ہے۔ یہ پیاس کیسے بجھے؟ دنیا کے دریاؤں، دریاؤں کی موجوں اور موجوں کے قطروں کی تلاش اس ازلی پیاس کو بجھانے کے لیے کافی نہیں۔ محبت میں گھرے ہوئے قطروں کی آبشار اس پیاس کی سیری کر سکتے ہیں۔





گیر و دار

جوش و غضب

کمال کو زوال نہیں ہوتا۔ صرف حقیقت میں تبدیلی آجاتی ہے اور کمال کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس کے افسانے تو مٹنے ہی تھے اور ان افسانوں کے عنوانات کو بھی ختم ہونا تھا۔ نشو و ارتقا کی یہی ٹیڑھی منزل ہے جو بعد میں زوال کے نام سے پکاری جاتی ہے۔

تمام اندھیرے ایک ٹمٹماتے ہوئے دیے سے خائف ہیں۔ ظلمت کی صدیوں کو اگر شکایت ہے تو چند چراغوں سے جو کبھی کبھار کسی نازنین کے اشارے پر جگمگا اُٹھتے ہیں اور ظلمت کی ان صدیوں کو چند ساعتوں میں بے نقاب کر دیتے ہیں۔

دل میں کبھی کبھار کوئی چنگاری اُٹھتی ہے جو نور کی مانند چہرے کو تمتما دیتی ہے۔ اسی چنگاری میں کبھی کبھار کوئی چہرہ کوئی کافر صورت شوق کا امتحان لینے پر مصر رہتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جو کچھ بھی رختِ سفر تھا وہ پہلے ہی نثار کیا جا چکا ہے۔

جب کبھی کوئی خوابوں کے خیابانوں سے اُتر کر احساس کی آغوش میں آجاتا ہے تب اکثر فکر و ادراک کو دیواروں کے شگافوں سے کچھ جالے صاف کرنے پڑتے ہیں جو انسان کی کار برداریوں میں حایل ہوتے ہیں۔

طوق و زنجیر کا نام ہے ظلمات۔ اس کی نہ ابھی صبح ختم ہوئی ہے اور نہ شام۔ اسی ظلمات میں کئی کارواں ٹھہرنے کی کوشش میں مصروف رہیں اور انسان اس ظلمات کو تغیّر کا نام دے دے کر اپنے بسیرے لگائے گا چاہے اُسے زہر ہلاہل کے علاوہ کچھ

بھی حاصل نہ ہو اس تغیر میں امید کی کرن بھی پوشیدہ ہے۔ لہٰذا ایسی ظلمات میں ہی کبھی نہ کبھی وصال کی شمع بھی روشن ہو گی۔

رات کو دل عموماً کوئی حسین اشارہ پاکر اداس ہو جاتا ہے اور کسی بندھن کی غیر موجودگی میں رات بھر ستاروں کے ذریعے سکھ کے خواب تو دیکھے جا سکتے ہیں لیکن عشق کو ضیاء صرف مہتاب سے ہی ملتی ہے تخیل اپنی شوخیاں ستارے گن کر نہیں دکھاتا بلکہ مہتاب سے شہ ضرور پاتا ہے۔

دوستی کا ہاتھ بڑھانا ہو تو دریا کے ساتھ دوستی کے عہد و پیمان کرو، نہ کہ حباب کے ساتھ اور اگر کوئی سبق سیکھنا منظور ہو تو صبحوں کے حسین گداز خطوط سے سیکھنا چاہیے نہ کہ خوابوں سے، بھلے وہ کیسے ہی فسوں ساز کیوں نہ ہوں۔

عشق کے نتائج بھگتنے کے بعد بھی کوئی اس سے عبرت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتا لہٰذا میری تلقین ہے کہ وہ عشق کے اس کھیل سے درگزر کرے۔ عشق دراصل ایک زنداں ہے جس سے نکلنا ہر ایک کا کام نہیں۔ اگر کوئی بمشکل نکل بھی آیا تو اُسے تاحیات ننگی شمشیر پر چلنا ہو گا۔

جس شہر میں ہم مقیم ہیں یہاں معافی دینے کی روایت نہیں۔ جرم معمولی ہو یا سنگین ہر جُرم کی سزا ہمارے شہر میں گردن زدنی ہے۔ لہٰذا بچ کر داخل ہونا اور محتاط ہو کر زندہ رہنا۔ زندگی میں کیے گئے گناہوں کی معافی کی روایت سے یہاں کوئی بھی واقف نہیں۔

تم کون ہو میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ یا تو تم میرا خواب ہو یا میرے خواب کی تفسیر ہو۔ اگر یہ بھی نہیں تو میرے دستِ دعا میں پڑی ہوئی ایک ایسی آہنی زنجیر ہو جس نے مجھے

دعا مانگنے سے بھی روک دیا ہو کیوں کہ اگر میری دعا منظور ہو جاتی تو تم میرا خواب نہیں رہتے بلکہ اس کی تفسیر بن کر سامنے آجاتے۔

نزع کا عالم آپہنچا ہے، حالت دگرگوں ہے لیکن اس وقت بھی میری کوئی تمنا نہیں جس کی تکمیل چاہوں مجھے آپکو دیکھنے کی خواہش نہیں۔ ایسی حالت میں آپ کے آنے میں اب کیوں تاخیر ہو رہی ہے۔

کوئی اجنبی اگر کسی شہر میں داخل ہو جائے تو اس کی اجنبیت اسے دَر بہ دَر ٹھوکریں کھانے پر مجبور کرتی ہے۔ دیدۂ پُرنم لیے وہ اپنا مسکن ڈھونڈتا ہے لیکن اس تلاش میں اس کا اپنا نام ونشان مٹ جاتا ہے۔ اس کی اجنبیت اُسے غمزدہ بنا دیتی ہے اور وہ اپنے دِل کا قرار اور دماغ کا توازن کھو بیٹھتا ہے۔

اوروں کی تو کیا انھیں اپنی بات بھی گوارہ نہ ہوتی تھی۔ ہر بات پر شام وسحر گمان وشک رہتا تھا۔ زمانے نے ہلکا سا پلٹا کھایا تو وہ اب اپنا اعتبار کھو کر خود مجھے ہی اپنا رازدان بنانے پر اُتر آیا۔ بس سے بات نکل جائے تو یہی عالم ہوتا ہے۔

جب گلستان چھوٹ جائے تو دل لازماً بیابان ہو کر رہ جاتا ہے اور وہ بھی ایسا بیابان جس میں نہ زندگی اپنی نظر آتی ہے اور نہ ہی موت۔ حتیٰ کہ زمین وآسمان بھی پرائے نظر آنے لگتے ہیں۔ گلستان سے بیابان تک راستہ تو بہت چھوٹا ہے لیکن وہاں پہنچا جبھی جاتا ہے جب سب کچھ راہ ہی میں لٹ جائے۔

اُلفت کا لطف کچھ نہ کچھ گالیاں کھانے میں ضرور ہے اسی لیے ہزار صلواتیں سُننے کے بعد بھی طوفان اپنے محبوب کو دیکھ کر اس کے نزدیک جانا چاہتا ہے۔ وہ دریچوں سے

بھی دیکھتا ہے اور چلمنوں سے بھی اور پھر موقع پاتے ہی اس کے نزد سرک جاتا ہے اور صلواتوں کا ایک بوجھ کندھوں پر اٹھا کر لے آتا ہے۔

ہم سب ایک عجیب اضطراب میں پھنسے ہوئے ہیں لیکن ہمیں اس کا رنج نہیں رنج صرف یہ ہے کہ جب تک آپ کی تصویر کے نقش نہیں کھنچے تھے۔ آپ کی حالت بھی دگرگوں تھی اور اپنی تصویر کو دیکھ کر آپ کو بہت مسرت ہوئی ہے کہ اس چہرے پر اتنے لوگ فدا ہوتے رہے۔

کسی بھی گل رخ کے ماتھے پر جلاّد کی سی چتون جچتی نہیں کیوں کہ ایسے چہروں کا کام دنیا میں مسکراہٹیں بکھیرنا ہے نہ کہ دنیا کو خوف زدہ کرنا۔ کوئی نہ کوئی پریشانی کا عالم ضرور ہوگا جو میرے محبوب کے چہرے کا تبسم غائب ہو گیا ہے اور اس کی جگہ پریشانی کی لکیریں کھنچ گئی ہیں۔

میرے کانوں میں ایک آواز گونجی اور ایسا لگا جیسے کسی کو میری تلاش ہو۔ ایسی حالت میں ایک جگہ جا کر کھڑا ہو گیا کہ ڈھونڈنے والا یقیناً وہیں سے گزرے گا۔ حدِ انتظار سے باہر جانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔

حالانکہ تم بہت سیانے سے لگتے ہو پھر بھی تمھیں کسی کو بار بار ستانے سے کیا حاصل ہوتا ہے۔

اس دنیا میں تم اکیلے ہی نہیں جو ستا سکتے ہو۔ ایک زمانے سے معمارِ محبت یہی کام کرتے چلے آئے ہیں۔

محبوب کے لبوں پر ایک لرزش سی ہے جو احساسِ محرومی کی غمازی کرتی ہے۔ انھیں اگر چُومنے کی اجازت مِل جائے تو نہ صرف یہ لرزش ختم ہوگی بلکہ وہ اپنی اس خبر سے بھی واقف ہوں گے کہ اُن کے لبوں کی لرزش کا باعث کیا تھا۔

عشق کی چشمِ عنایت ہی ہوتی رہے تو دنیا میں محبت کا قیام رہتا ہے۔ ورنہ عشق کا اپنا اثر عمرِ گریزاں کی طرح غائب ہو جائے۔ محبت کا راز تو داغِ عشق کی صورت میں قایم رہتا ہے۔ یہ راز فاش بھی ہو جائے تو عشق کا داغ اپنا اثر کیے بغیر نہیں رہتا۔

ہم تو یہ تماشا دیکھ رہے تھے کہ ان کی نگاہ سے کس کی نگاہ ملتی ہے اور نظر سے نظر ملانے میں کون خوش قسمت ثابت ہوتا ہے۔ ہزاروں اک نظر کے لیے بس کھڑے کے کھڑے ہی رہ گئے۔ جب کہ ہماری نظر یہ تماشا کرتے کرتے اُن کی نظر سے مل گئی۔

اس دنیا کی ہر صورت ایک ایسی گردش میں ہے جس سے اس کا اَتا پتا ہی نہیں ملتا۔ ہاں اگر اپنی خبر چاہتے ہو تو اپنے دل کی چار دیواری میں جاتے ہی مِل جائے گی۔

شباب کا نشہ کس کو دیوانہ بناتا ہے، محبوب کو یا اس کے چاہنے والے کو، اور وہ بھی کسی سیاہ رات میں جب ایسا لگے کہ ستاروں کی برات اُتری ہوئی ہے۔

طبیعت جب مچلتی ہے تو تمنّا ہر خوش گوار شے کو دیکھنا چاہتی ہے۔ اس وقت ایک اُمنگ یہ بھی اُٹھتی ہے کہ اسے بھرے بازار میں لے جاکر چھوڑ دیا جائے تاکہ یہ کسی شباب پرور حسین خریدار کو دیکھتی رہے۔

شام کا غبار اپنا ثانی نہیں رکھتا لیکن اسے دیکھا کیسے جائے۔ اس کی بہترین

صورت تو یہی ہے کہ وہ اپنے گھر کے کواڑ بند کر لیں اور شام کے ہوتے ہی کھڑکیاں کھول کر ان پر چلمنیں چڑھا دیں۔ ان کے کھڑکی پر آتے ہی ایک کہرام سا مچ جائے گا۔ آوازوں کا غوغا اُٹھے گا اور شام کے غبار میں ایک جاذبیت پیدا ہوگی اور اسے دیکھا جا سکے گا۔

ان کا مہلک وار خطا نہیں ہو سکتا۔ ایک ہی وار کے بعد چار سُو سُرخی پھیل جائے گی۔ یہ میرے لہو کی ہوگی یا میرے ٹوٹے ہوئے خوابوں کی۔ آپ سب اتفاق کریں گے کہ آپ نے ان کا صرف کرم دیکھا ہے عتاب نہیں دیکھا۔

میرے شکوؤں کی کوئی شنوائی نہ ہوئی اور میری خواہشات کے تقاضے مجبوری کے مقامات پر غائب ہو گئے۔ ان شکووں اور تقاضوں پر میرے فخر کی بنیاد قایم تھی۔ جو اب گرد و غبار میں تبدیل ہو چکی ہے۔ مجھے اپنے سرشت پہ ناز تھا جسے وقت کی عیاری نے نیست و نابود کر دیا ہے۔ اب میں زندہ رہ کر کیا کروں گا۔

رُوح کی گہرائیوں میں اُترنے کے لیے نہ تو دیر و حرم کی ضرورت پڑی اور نہ ان چراغوں کی جنھیں روشنی کا منبع بتایا جاتا ہے۔ یہاں کے نقشے الگ ہیں۔ یہاں جن کو امن کے گہواروں کی تلاش ہے، انھیں میدانِ جنگ کا سامنا کرنا پڑا ہے اور جو جنگ کے خواہاں تھے وہ امن کے پیرو کار ہو گئے۔

انسانوں کے جم غفیر غول در غول اُٹھے اور انجانے طرفوں کی طرف چل دیے۔ بستیاں دیکھتے ہی دیکھتے شہروں میں تبدیل ہو گئیں اور سُورج کی کرنیں بلندیوں کے پیچھے مُنہ چھُپانے لگیں۔ میرے ساتھ میرا ایک ہمسفر تھا جو صبح کی شبنم کو پاؤں تلے روندا کرتا تھا۔ شبنم کی جگہ اینٹ اور پتھر نے لے لی اور میرا ہمسفر نہ صرف میرا ساتھ چھوڑنے پر مجبور ہوا بلکہ وہ میرا نام بھی بھول گیا۔

آئینۂ دل پہ جب خراش پڑتی ہے تو پھر یہ خراش مٹنے کا نام نہیں لیتی۔ اس خراش کی وجہ پُرسشِ حال بھی ہو سکتی ہے۔ تُندخُوعشق کی بلاوجہ طلب بھی ہو سکتی ہے۔ آدمی کو آدمی کی تلاش کیسے رہتی ہے؟ کیوں رہتی ہے۔ زندگی میں اگر کوئی مہکتا ہوا چہرہ نظر آجاتا ہے تو تلاش کی روش بدل جاتی ہے۔ پھر وہی طلب، وہی تُندخوئی عشق اور وہی ایک خراش۔

میں ہر پیچیدگی کا پردہ فاش کرنا چاہتا ہوں۔ سنورے ہوئے گیسوؤں کا بھی جو چند لمحوں میں کسی دوش پر برہم ہو جائیں گے اور سُرمگیں آنکھوں کا بھی جو چند نظاروں کے بعد دیکھنا بند کر دیں گی۔ لیکن کیا کروں ہر معصوم عصمت کو کوئی نہ کوئی مکیں کسی نہ کسی چار دیواری کے عقب میں لے گیا ہے اور دروازوں پر بھاری قفل ڈال دیے ہیں۔ ان لمبی راتوں کا پردہ فاش ہوئے بنا باقی کے سب رازجوں کے توں رہ جائیں گے۔

سب نے ہاتھ میں پتھر اُٹھا رکھے ہیں اور قتل گاہ میری ہی رہگزر میں بنی ہے۔ دنیا نے میرے خاتمے کی ٹھان رکھی ہے لیکن مجھے خبردار کرنے کے لیے مجھے خواہشِ پرواز بھی عنایت کی ہے۔

بُتوں کا حُسن میری ہی ایک نظر کے لیے بنا ہے۔ اس لیے کہ میری شام و سحر خشک نہ گذرے۔ ہر موجِ صبا اور چشمِ شوخ کو اس کام پر مامور کر دیا گیا ہے۔

یہ نیستی کا مقام اور یہاں کے سب مکیں نیستی کے باشندے ہیں۔ لیکن عجب بات ہے کہ سب اسے ہستی کے مترادف گردانتے ہیں۔ ساتھ ساتھ سب کا یہ بھی ایک پختہ خیال ہے کہ اُن کی کسی نہ کسی طرح اس جہاں میں پرواز قایم رہے گی۔

اگر فردوس بروئے زمین پر ہے تو دوزخ کیا ہے، کہاں ہے۔ بشر کا دم گھٹنے لگا

ہے تو اُس کے لیے چیخنا لازمی تھا کہ فردوس میں اس کو کیا ہو رہا ہے؟

جب ہم تمہارے خواب میں سے کسی نہ کسی طرح نکل گئے تو تمہارے کرب میں اور اضافہ ہو گیا۔ اس پر ہمارا یہ استفسار کہ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے بہت مناسب تھا۔ سنائیے کیسی طبیعت ہے ہمارے بغیر۔؟

جیسے صحرا ذرّے میں دکھائی دے سکتا ہے ویسے ہی دریا حُباب میں بند نظر آتا ہے۔ میری زندگی کا حاصل ایک خواب ہے جس میں خود بیکرِ تمنا بن کر رہتا ہوں۔ اسی خواب میں مَیں زندگی کی کُل جدّوجُہد دیکھتا ہوں۔

طوفان اپنے حبیب سے ذرا بچ کر رہنا، کیوں کہ ہو سکتا ہے وہ دوستی کا دعویٰ کرے لیکن کیا دنیا میں ان کا کوئی دوست باقی بچا ہے جسے گزند نہیں پہنچی۔

آپ کی محفل تو تمام ہو گئی اور آپ کے ناز اُٹھانے والے سب تتّر بتّر ہو گئے ہیں۔ ایسی حالت میں جب آپ بے یار و مددگار تنہا ہیں، آپ کو ہماری محفل کی رونق بننا کیوں منظور نہیں؟

آپ ابھی تو آئے تھے اور ابھی آپ جانے کے لیے بھی مُصر ہیں۔ جانے کا اعتراض نہیں لیکن کیا دوبارہ واپس آنے کا کوئی نیا اقرار کرنا منظور کیا ہے۔

خط کا انتظار! نامہ بر پیغام لے کر تو آیا ہے۔ اب اُس کے مُنہ کی طرف کیا تک رہے ہو، کیا کسی خط کا بھی انتظار ہے جو زبانی پیغام کے علاوہ ہو۔

تیرے ہمہ گیر تبسّم میں ایک سوال لرزاں ہے۔ دراصل یہ تبسّم ایک سوال ہے کہ بتاؤ اس میں اور قوسِ قزح کے ٹکڑے میں کیا فرق ہے۔ اس میں اور ایک اُلفت کھوئی ہوئی دوشیزہ میں کیا فرق ہے۔ تیرے اس سوال سے ہی تو لطفِ شباب ہے۔ جواب سے رُوح کی سیری آج تک نہیں ہوئی اور نہ ہوگی۔ دریا کا نرمی سے چلتا ہوا پانی تیرے تبسّم کی طرح ہے لیکن اس کا جواب ندارد ہے۔ لطفِ شباب سوال پر ہی منحصر رہے گا۔

گھوڑا تیز رفتار ہے۔ کہیں تھک کر رُک جائے گا۔ رکاب مضبوط ہے پاؤں کو تھامے رہے گی لیکن جب سوار نڈھال ہوگا پاؤں رکاب سے چھوٹ جائے گا۔ رفتار کا تعلق نہ رکاب سے ہے اور نہ تیز رفتار گھوڑے سے۔ وہ رفتار تو اس آواز پر منحصر ہے جس کے آتے ہی میں ٹھہر گیا اور پھر جب کسی نے کہا کہ تخیّل سے نکل جاؤ تو نکل جانا پڑا۔ نہ رخش، نہ رکاب۔ ایک آواز ہے جو رفتار کا موجب بنتی ہے۔ زندگی میں شباب کا لُطف اُٹھانا ہے تو اس آواز کو سُنو۔

تمھارے لبوں سے الفاظ یوں نکلتے ہیں جیسے دھیمی دھیمی پھوار پڑ رہی ہو۔ کتنے شیریں ہیں یہ لب اور خوب صورت حوروں کو ان کی مملکت پر ناز ہے۔ نہ جانے جونہی میرے لب انھیں چُومنے کی کوشش کرتے ہیں ان میں ایک کپکپی

سی پیدا ہو جاتی ہے اور میرے ہونٹوں سے انھیں کوئی عناد سا پیدا ہو جاتا ہے بے سمجھی کا تو کوئی علاج نہیں۔ ایک بار ان کا لمس ہوتے دو پھر دیکھو قیامت کیا کیا رنگ بدلتی ہے اور خدا کا رعب و داب کیسے ختم ہوتا ہے۔

زندگی کے پیچ و خم کسی دُلہن کے گیسوؤں سے زیادہ پیچیدہ نہیں ہوتے۔ گیسوؤں کے پیچ و خم میں نہ صرف سنہرے مہتاب چھُپے رہتے ہیں بلکہ ان کے بغیر پائل کی آواز بھی نہیں آسکتی۔ زندگی کے پیچ و خم تو مغموم فسانوں کے علاوہ کچھ اور رنگینی دینے سے عاری ہیں لیکن ان اُلجھے ہوئے گیسوؤں کا غرور تو فرعونیت کو ماند کر دیتا ہے۔

ایک خوب رُو نے اپنی حفاظت کے جُملہ سامان اکٹھے کر رکھے ہیں اور اس کے چاروں طرف غنیموں اور غیر لوگوں کا جمگھٹا ہے۔ ان میں سے کئی اس کے عدو بھی ہیں۔ تاہم اس کی بصارت کا تقاضا ہے کہ وہ مَردم شناس ہے۔

شبِ تاریک میں وہ گھر سے باہر آتے ہوئے خوف زدہ ہو جاتا ہے کہ کہیں کسی تاریک کونے میں اُسے میں کھڑا نظر نہ آجاؤں۔ دن کے اُجالوں میں جب میرے نقش و نگار خوب پہچانے جاتے ہیں۔ وہ مجھے اپنی شوخیِ نظارہ کی دعوت دینا منظور نہیں کرتے۔ میں انھیں نہ اندھیرے میں اچھا لگتا ہوں اور نہ اُجالے میں۔ اُن کی نظر میں کوئی اور رچا ہوا ہے۔

انسان خواب میں فطرت کے اشاروں پر سرسبز شاہراہیں بناتا رہتا ہے لیکن

جونہی وہ خواب سے چونکتا ہے تو نہ صرف شاہراہیں غائب ہو جاتی ہیں بلکہ خواب کو بُننے والے تارِ حیات بھی بکھر جاتے ہیں۔

یہاں رہ گزر کے طالب بھی ہیں اور دُوریِ منزل کے بھی۔ کوئی بندِ قبا کھولنا چاہتا ہے تو کوئی چلمن سرکانا۔ کسی کو ہاتھوں میں شیشہ و جام چاہیے اور کسی کو نیلی جھیل کی تہہ میں پہنچنے کی خواہش ہے۔ دنیا میں کوئی شخص خطاوار نہیں اور نہ کوئی گردن زنی کے قابل۔ نہ کوئی سنگساری کی سزا کے لائق ہے اور نہ کوئی دشنام طرازی کے اہل ہے۔ خواہش ہی سب کو خطاوار ٹھہراتی ہے لیکن ان خطاواروں سے کوئی قصور سرزد نہیں ہوتا۔





مجازی و حقیقی

طبل و دف

لالہ رُخ چہروں سے فریب کھانا اور کدال کا چلانا ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ دونوں میں اذیت ہے اور مسرت کا نام و نشان نہیں۔ لالہ رُخ چہرے دیکھ کر ہو سکتا ہے مُنہ سے نغمے پھُوٹ پڑیں اور کدال کی ضرب کے بعد عوضانہ ملتے ہی نغمہ کچھ نئے انداز سے نکلتا ہے۔ زندگی کی داستان اپنے دامن میں پریشانی سمیٹے ہوئے ان ہر دو کرتوتوں سے مکمل نہیں ہوتی۔ اس کے لیے کسی الگ ہی خنک ہَوا کی ضرورت ہے۔

یہ بے آسرا دنیا نہ صرف فانی ہے بلکہ باطل بھی ہے اور یہی وجہ ہے کہ عشقِ مجازی فنا بھی ہوتا رہتا ہے اور جھوٹ کی دلدل میں اپنے پاؤں بھی گاڑے کھڑا رہتا ہے۔ دراصل جو فانی ہے وہ باطل ہے۔ خدا کے تصوّرات کی حکایت باطل ہے اور فانی بھی۔

خدا پرست ہونا اور خدا پرستی پر قربان ہو جانا دو الگ الگ حقیقتیں ہیں۔ اگر خدا کے کرم گردانے جائیں تو وہ اتنے ہیں کہ انسان کو ہوش میں آتے ہی اس کے راستے پر چل پڑنا چاہیے تھا۔ (چاہے وہ راستہ معلوم ہو یا نہ ہو) ورنہ سانسوں کا یہ ساز تو ازل سے بج رہا ہے۔ اور ابد تک بجتا رہے گا۔ اس دوران میں جُملہ کیے گئے افعال پر نثار ہونے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔

عشق ایک عظیم مرض ہے جو ہر شخص کو لاحق نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ایک الگ قسم کی فطرت چاہیے جو خدا کی اور روزِ محشر کی سرحدوں کو چھُوتی ہو۔ اس مرض میں مبتلا ہونے کے لیے کسی پر فدا ہونا ایک اہم فریضہ ہے۔

یہ مجھے بخوبی معلوم ہے کہ میری ہر خطا معاف کردی جائے گی۔ یہ معافی کون دیگا، یہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ کام وہی کرے گا جو رحم کرنا جانتا ہوگا۔ لیکن کیا ہر معافی سے پہلے خطا کا ہونا ضروری ہے۔ کیا بغیر خطا اس کی رحمت کو مسکرانا نہیں آتا، اور پھر خطا کیا ہے؟

مَیں جانتا ہوں کہ روزِ محشر کسی نے میری فریاد نہیں سُننی ۔ مَیں چلاّتا رہوں گا اور خداوند رحیم اپنا حکم نافذ کرتا رہے گا۔ میرے ساتھ انصاف ہوگا یا نہیں، مَیں وثوق سے نہیں کہہ سکتا لیکن انصاف کرنے کے عمل کے ساتھ خدا کے وجود کا ہونا لازمی ہے۔

خدا کی ذات کے بارے میں مجھے خود کافی معلومات ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں کسی سے کچھ پوچھنا نہیں۔ یہ ایک ایسی حسین جُستجو ہے جس کے لیے کوئی جدّوجُہد کرنی نہیں پڑتی۔ دنیا میں ایک کاوش ہے جس پر مجھے ناز ہے، اور یہ وہ کاوش ہے جس کے لیے کسی جستجو کی ضرورت ہی نہیں۔

جسے فقیری چاہیے وہ اسے حاصل کرے، جسے پیری درکار ہے وہ اس کا تعاقب کرے۔ فرار کی کئی راہیں ہیں جس نے جو راہ اختیار کرنی ہو وہ بے شک اختیار کرے۔ مجھے کسی کی روش اب رنجیدہ نہیں کر سکتی اور نہ کسی کی خودی متاثر کر سکتی ہے، سب ایک ہی خاک میں اَٹے ہوئے ہیں۔ اس خاک کا راز کسی پر عیاں نہیں۔ خاک کس نے اُڑائی ہے۔؟

مَیں برسوں خانقاہ میں اکیلا ہی سجدے میں پڑا رہا اور جب مسجد کا رُخ کیا تو وہاں پر بھی اکیلا ہی نمازی تھا۔ خدا سے التماس کرنے میں بھی کوئی میرا شریک نہ تھا، لیکن پھر بھی میں نے خدا سے کوئی التماس نہیں کی۔ میں کس خدا کا نمازی تھا اور یہ نماز کس مسجد میں ادا ہوئی تھی؟

مجھے تو خدا کی کُل کاریگری اُداس نظر آتی ہے۔ یہ اُداسی مُرغانِ سحر میں بھی نمودار ہے اور خدا پرست پرہیزگاروں کے ہاؤ و ہو سے بھی۔ اس ساری کائنات میں صرف تمھارا چہرہ ہی مُسکراتا نظر آتا ہے۔

خدا کی شان کے مطابق ہر بشر نہ صرف اشرف المخلوقات ہے بلکہ اس میں عکسِ کبریائی بھی ہے۔ اس میں خود کو تعمیر کرنے کی طاقت بھی ہے۔ اس سب کے باوجود وہ اعجازِ زمانہ کی بدولت نہ صرف تنہا ہے بلکہ اس کی ہر بات میں ایک نشتر پوشیدہ ہے۔ یہ خدا کے سامنے ہاتھ پھیلائے یا گداگر کا پیشہ اختیار کرے۔ وہ مخلوقات کی حقیقت سے بھی غافل ہے۔

انسان اس دنیا میں وفا کا متلاشی رہتا ہے اور ایسی صحبت کی جو باوفا ہو۔ ان دونوں کی تلاش ایسی ہی مہمل ہے جیسے لوگ خدا کی تلاش میں اپنی زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جس پر کبھی جان چھڑکی جاتی ہے وہ ایسا رُخ پھیرتا ہے کہ بس رُخ پھیر ہی لیتا ہے۔ زندگی ویران سی نظر آتی ہے۔ ایسے میں اعجازِ مسیحا کی تلاش بھی رایگاں جاتی ہے کیوں کہ کوئی مسیحا عشق و ویرانی کی حالت میں کارگر نہیں ہوتا۔

ہزار طریقوں سے قلندری کے راستے اپنائے جا سکتے ہیں۔ کوئی تابعِ تقدیر ہے تو کوئی مردِ تدبیر۔ یہ سب راہیں زندگی کو لازوال بنانے کی تدبیریں ہیں، اس لیے اگر ایک خدا سے کام نہ چلے تو اور بھی نئے خداؤں کی بنیاد ڈالی جا سکتی ہے۔ جیسے جیسے خدا انسان کی گھات میں رہتا ہے، ویسے ہی انسان خدا کو اپنے دام میں لانے کی سوچتا رہتا ہے۔

کسی صاحبِ یقین کے لیے نجات کا راستہ ایک لفظ ہی ہو سکتا ہے نہ کہ کتابوں کے عجائب گھر۔ آشنائی کا فیض ایک ہی شخص کے قرب سے نصیب ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے ملاقاتیوں کے تانتے کی ضرورت نہیں۔

جب کوئی گہرے خیالات میں غرق ہو اور کوئی اچانک مے کے بھرے پیمانے کی صورت چھلکتی ہوئی رخنہ اندازی کرنے لگے تو اس کے مہکتے ہوئے قدموں کی چاپ سے خیالوں کو پسینہ آنے لگتا ہے اور انھیں ایسے نازک لمحوں کا احساس ہونے لگتا ہے جیسے کسی معصوم تبسّم نے تمام مظالم کا خاتمہ کر دیا ہو۔

محبوب کا تغافل جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا نہیں ہوتا ہے اور اس کا علاج بھی اتنا ہی مشکل اور جان لیوا ہوتا ہے جتنا کہ تغافل۔ تغافل محبوب کی فتنہ گری کا ایک ادنیٰ سا نتیجہ ہوتا ہے جس کا علاج نہ جام میں ہے نہ شراب میں۔

بیشتر انسان خدا کی عظمت کے قایل ہیں لیکن جب وہ زندگی کے ہر پہلو میں نشیب و فراز دیکھتے ہیں تو وہ یہ سوچ کر تھک جاتے ہیں کہ کہاں خالقِ جہاں کا درجہ و اس کی عظمت اور کہاں یہ نشیب و فراز سے خوف زدہ کائنات۔

خدا کا اگر وجود ہے تو وہ حدِ عقل کے اندر آنا چاہیے۔ ورنہ اُسے اُن بستہ رازوں کا ایک راز سمجھا جائے گا جسے سمجھنے کے لیے کسی عقل کی ضرورت نہیں۔

خودی کو اپنا یا جانا اس لیے ضروری ہے کہ خدا کی ذات عقل و فہم سے بالاتر رہتی ہے۔ اگر عقل و فہم کو درمیان سے ہٹا دیا جائے تو خودی کی تلاش بے معنی ہو جاتی ہے کیونکہ انسان کی ذات بہ ذاتِ خود خدا کی ذات کا ہی تخیل بن جاتی ہے۔

انسان انسان کا حاسد ہے اور اُس کے اس حسد نے اُسے انسانیت سے الگ کر کے رکھ دیا ہے۔ انسان کی تمام ترقوتیں اُسے صرف انسان بننے کے لیے عطا ہوئی تھیں لیکن اس جدّو جہد میں وہ خود خدا بن کر سامنے آگیا۔

میری انجمن نہایت مختصر سی ہے اور اس کا انحصار صرف ایک شخص پر ہے جو میرا محبوب ہے۔ وہ نہیں تو یہ مانندِ خلا رہی جسے پُر کرنے کے لیے اپنے ساتھ سینکڑوں ماہ رخوں کو بٹھانا پڑا لیکن اس انجمن میں کسی کے بیٹھنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔

میرے محبوب کا خیال تھا کہ اگر میں زیادہ انتظار کرنے پر مجبور کیا گیا تو میں مٹ کر رہ جاؤں گا لیکن اُسے کیا معلوم کہ یہ عرصۂ انتظار مجھے راس آجائے گا اور موت کی آمد کے انتظار کو بھی آزما کر دیکھا جائے گا۔

میرے محبوب کو مجھے تڑپانا مقصود تھا۔ اس نے اپنی محفل میں میرے تمام رقیبوں اور اغیار لوگوں کو اکٹھا کر لیا اور مجھے انتہائی اذیت دے کر تڑپانا چاہا۔

خدا اور شیطان دونوں کے ایک ہی مقام ہیں کیوں کہ دونوں کی کوشش ہے کہ یہ مشتِ خاک انسان ان کے قدموں کی پیروی کرے۔

انسان ہر شے کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کی کاوش اتنی ہی رہتی ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے حاصل نہیں کر سکتا۔ عشقِ حقیقی ہو یا مجازی، دونوں کو اپنا کر انسان نے دیکھ لیا کہ وہ اس کی کوشش سے باہر ہیں۔

شے وہ سنبھال کر حفاظت سے رکھی جاتی ہے جو اپنی کہلائے اور جس پر اپنا

اختیار ہو۔ حکمت نے اکثر یہ نقطہ بے نقاب کیا ہے کہ یہ جسم اپنا نہیں۔ لہٰذا اس کی تواضع کرنے میں فراخ دلی سے کام لینے کا کوئی مطلب نہیں، کوئی نفس اپنا نہیں، کسی تبسّم کو مُدام نہیں، کسی خواب کی تفسیر اپنے ہاتھ میں نہیں۔ اپنی عزّت اپنے ہاتھوں میں محفوظ نہیں۔ اس لیے کوئی مجذوب بار بار آکر یہ بات سُناتا ہے کہ پیغامِ اَجل بھی اپنا پیغام نہیں، نہ دامن کی ہوا اپنی ہے۔ ان سب کو کیسے سنبھال کر حفاظت سے رکھا جائے۔

خودی نہ بلندی میں نظر آتی ہے نہ پستی میں۔ کسی بھی دَور میں یہ ممکن نہیں کہ خودی کا احساس ہو۔ کیوں کہ ہر دَور زوالِ خداوندی کا دَور رہا ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو خدا سے ہی کوئی بہانہ کر کے پوچھ لو۔

میری اُمیدوں کا خورشید اُس وقت ڈوبا جب میں اپنے ہی مقاصد کی پیروی کرتے کرتے نڈھال ہو کر گر پڑا۔ میں خدائی کا امتحان لے رہا تھا۔ میری حقیر سے حقیر خواہش بھی سینے سے باہر نہ نکل سکی۔ حالاں کہ بتایا یہ گیا تھا کہ شوق کو امتحان دینے کی ضرورت نہیں۔ خدائی خود میرے سُود و زیاں سے واقف ہے۔

میرا دل و دماغ کُھلا تھا، تاہم میں گرفتارِ عشق ہوا اور یہ صورت کسی معجزے سے کم نہیں۔ یہ اعجازِ خدا کی مرضی کا ہی ایک حصّہ ہے کیوں کہ ہو کے وہی رہتا ہے "جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔"

اس کون و مکان میں کون مجبور نہیں۔ اگر ہم مشعل دل بجھانے پر مجبور ہوئے ہیں تو خدا کی ضرور کچھ مجبوریاں ہوں گی۔ اسی لیے انھی لوگوں کو تمکنت بخشی جاتی ہے جن کے شوق کا نہ کوئی عنوان ہے اور نہ ہی جن کی بزم کبھی چراغاں ہوتی ہے۔

اگر خدا کے عکس کی موجودگی صنم میں اتنی ہی ہے جتنی بُت خانے میں ہے تب تیرے حُسن کا وجود اتنا ہی آبادی میں ہے جتنا ویرانے میں ہے۔

محبوب کے لبوں کا تبسّم کبھی کبھی رنجش میں اس لیے تبدیل ہو جاتا ہے تاکہ خوشی کی فضا کے لمحات کو اس بات کا احساس ہو جائے کہ یہ جلد ہی کسی نئے موسم کی جلن میں تحلیل ہونے جا رہے ہیں۔ تتلیاں خوشی سے اُڑنے لگتی ہیں تو ان کے پَر سکڑ جاتے ہیں۔ محبوب کی باہوں میں خوشی حاصل ہونے لگتی ہے تو آنسو آنکھوں کے کاجل کو دھونا شروع کر دیتے ہیں۔

جیسے مشتہر ہونے کے لیے لازمی ہے کہ خفیہ طور سے رہا جائے ویسے ہی کسی چہرے کو خوب صورت کہلانے کے لیے پردے کی ضرورت رہتی ہے اور آنچل کی۔ زندگی کا علم تبھی ملتا ہے اگر اس کے پیچھے کوئی چہرہ ہوتا ہے۔

میرے رفیق جو پسِ زنداں تڑپ رہے ہیں اُس دن صبحِ آزادی کا منہ چومیں گے جب وقت کی رفتار اُس زنداں کو نیست و نابود کر دے گی لیکن پیشتر اس کے کہ وہ صبح طلوع ہو۔ کئی اندھیرے میرے رفیقوں کے گلے ملتے رہیں گے۔ رفیقو! حوصلہ مت ہارنا۔ زنداں کی دیواریں گرنے والی ہیں۔ صبح طلوع ہونے والی ہے۔





خُورشید و قمر

شِیشہ و جَام



تاریخ فنا و ہستی کے بارے میں کچھ نہ کچھ رقم کرتی رہتی ہے اور اقوام کے تمدّن کا پتہ بھی اسی عبارت کی نہاں صورت سے ملتا ہے۔ اس تہذیب کے کونوں کھدروں میں پڑے ہوئے شکستہ ساغر و شیشے سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی چھاتی پر کتنی مونگ دَل چکے ہیں۔



آنسو بہا اور تھم گیا۔ زخم لگا اور سِل گیا لیکن چھِل جانے کے بعد۔ یہ طلسمِ محبّت ہے۔ جب ہونٹوں پر ہونٹ رکھے جاتے ہیں اور ہلکی گلابی لہریں آنکھوں سے اُبھرنے لگتی ہیں تو یہ بھی محبّت کا طلسم ہے انقلاب کا نہیں جس کی پیروی میں نہ جانے کتنی جوانیاں برباد ہوگئیں۔



ہر بشر جان کی حفاظت کا بہ ہر صورت درماں تلاش کرتا ہے لیکن یہ تبھی ممکن ہے کہ جان بازی پر لگا دی جائے۔ اس جان کی بازی لگانے میں اگر سر پر کفن باندھنے میں دیر ہوگئی تو عین عالمِ شباب میں ہی لوگ ڈھلنے لگ جاتے ہیں۔



تہذیبِ نَو کے خالق جنگل کے مور نہیں تھے جو چھُپ کر ناچتے۔ وقت نے ان کو بھی نوالہ بنالیا اور ان کے رقص کی چنداں پروا نہ کی۔ خالقوں کی جملہ خوشگواریوں

کی ایک ہی رہ گزر تھی جس کی بنیاد فولاد کے مرکّب پر مبنی تھی۔



میرا قتل آسان کام نہیں لیکن جب ایک ہوش رُبا نے مجھے ختم کرنے کی ٹھان رکھی ہو تب بھی اس فعل کے لیے کافی سامان اکٹھے کرتے پڑتے ہیں اور یہ سب سامان صرف مجھے مقتل پہنچانے کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ہر شے کی فراہمی کے ساتھ ان کی ادا کا ہونا بھی ضروری ہے۔ در اصل میرے قتل کا سامان فراہم کرنا ہی اس کی اداؤں کا ایک اہم حصّہ ہے۔



آسمان مخلوق کے سر پہ ایک بوسیدہ سی چھت بنائے کھڑا ہے اور لوگ ہیں کہ بارش کی عدم موجودگی میں بھی اس بوسیدہ چھت سے بہتے ہوئے پانی میں، جو مسلسل کیچڑ بنتا جا رہا ہے، پڑے گلتے رہتے ہیں۔



رات کی طوالت ختم ہوئی، سحر طلوع ہوئی، شباب کا طلسم ٹوٹا۔ گذشتہ لمحات سے ڈھلا ہوا عشق کافور ہو گیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے محبّت کا درد ختم ہونے لگا اور زندگی کی تمام رنگین کش مکش ایک معمولی سی بات میں بدل گئی۔



اُن کے جمال کی کیفیت کے بارے میں کچھ استفسار کرنے کی ضرورت نہیں

اور وہ اس لیے کہ وہ جب بات کرتے ہیں تو اُن کی ہر بات جلوؤں سے معمور ہے۔



رات کے ہنگاموں کے بعد جب سحر نے کائنات کا اسرار کھول کر رکھ دیا تو انفاس کی گرمی کے بھرم نے بھی دَم توڑ دیا اور وہ عشق کی زندگی جس میں تمام گذشتہ لمحات بھرے تھے ایک خرافات سی نظر آنے لگی۔



یہ دنیا نہ غلام کو راس آئی اور نہ ہی سلطان کو، نہ امام کو اور نہ فرعون کے مُریدوں کو۔ یہ شاذ و نادر ہی کسی کو راس آئی ہے۔ ایسی حالت میں ایک ہجومِ بیکراں سے کوئی صورت اپنے جلووں سمیت پاس آجائے تو دنیا کے راس آنے کی کوئی صورت بن سکتی ہے لیکن ضمیر نہیں مانتا کہ اتنے ہجوم سے کوئی صورت نکلے۔



گردشِ فلک چین کیسے لینے دے۔ اُس نے سب کو ذرّوں اور لمحوں میں بکھیر رکھا ہے۔ عاقبت شناس لوگ بھی گردش کی اس کیفیتِ دست بُرد سے نہیں بچ سکے۔ اگر کوئی اس کے اسرار سے آگاہ ہونے کی کوشش کرے تو اُسے یاس کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔ اس یاس کا نام کئیوں نے یقین رکھ دیا ہے۔



رات بھر جن کو نیند نہیں آتی وہ معرفت و محبت کے نشے میں چُور رہتے ہیں۔ ان کا امتحان سحر ہونے تک ہو جاتا ہے، لیکن انھیں بیدار کرنے کی ضرورت ہے جو

کسی تخییّل کا سہارا لیے ہوئے دل کو کسی راہ پر لگا کر خوابِ غفلت میں کھو جاتے ہیں۔



تخیّل کا سر و سامان سِوائے وہم و خیال کے کچھ نہ نکلا اور جب تخیّل نے جوش کی شگفتگی دِکھائی تو بد حواس شہر نمودار ہونے لگے۔ ان کے پردۂ فریب کو ہٹا کر دیکھا تو لُٹے ہوئے دہقان اور مانگے کے اُجالے کے سِوا کچھ نظر نہ آیا۔



ایک عرصے کی ملاقات کے بعد وہ آناً فاناً غائب ہو گیا۔ زندگی انگاروں پر لوٹنے لگی۔ اپنا جگمگاتا ہوا بدن آہستہ آہستہ خشک ہونے لگا۔ اس کے ساغرِ خیال خالی ہونے شروع ہو گئے، لیکن اُسے ایسے غائب ہونا نہیں چاہیے تھا۔ مَیں جو کبھی کوئے جاناں سے باہر نہیں نکلا، اب مجھے دَیر میں بھی جانا پڑا اور حرم میں بھی۔ اپنی شکستہ حالی نے مے خانے میں جانے سے روکا تو سہی لیکن میری تلاش رائیگاں نہیں گئی۔



میرے دل کی حالت عجب حالت ہے۔ کوئی دردمند نہیں تو کوئی قید و بند بھی نہیں۔ کسی کے نام کی خلش منگ بھی نہیں کرتی اور کسی کا انتظار بھی نہیں، البتہ اپنی تلاش

میں جاتا ہوں تو تمھاری کھوج میں گُم ہو جاتا ہوں۔



بُلبُلوں کا بانکپن آزادی کے ماحول میں اپنی ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن جونہی موقع پرست صیّاد نے دامِ فریب بچھایا اور اس کا اندازہ بُلبُلوں کو ہونے لگا تو ان کا بانکپن ہی بدل جاتا ہے۔

ہم روشنی فکر

دراصل افکارِ زندگی کا مجموعہ ہے
جو کہ نسوانی ادب کی ایک مشہور شاہکار نگارش
از سی آر داس سریشٹر کی تخلیق ہے
جو نہ نثر اور نظم ہے بلکہ پسندیدہ شعاع کا حصہ ہے
جس میں آدھوں حقیقت کا مختصر جائزہ شامل ہے

